لیو ہیوبرمین

یورپ امیر کیسے بنا

سرمایہ داری نظام کے عروج کی کہانی

ترجمہ و تلخیص: عبداللہ ملک

لیو ہیوبرمین

یورپ امیر کیسے بنا

(سرمایہ داری نظام کے عروج کی کہانی)

ترجمہ اور تلخیص: عبداللہ ملک

مشعل بکس

آر بی۔5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور۔54600' پاکستان

MashalBooks.com

Leo Huberman:
Man's Worldly Goods
Published in English by: Monthly
Review Press, New York
Copyright (English) Monthly
Review Press
Urdu translation & abridgement:
Abdullah Malik
Published by: MASHAL

لیو ہیوبرمین : یورپ امیر کیسے بنا

ترجمہ و تلخیص : عبداللہ ملک

ناشر : مشعل

MashalBooks.com

MAN'S WORLDLY GOODS

by

LEO HUBERMAN

Urdu Translation & Abridgement

Abdullah Malik

Published in English by Monthly Review Press, New York
Copyright (English) Monthly Review Press

Publisher: **MASHAL BOOKS**

RB-5, Second Floor,Awami Complex, Usman Block,
New Garden Town, Lahore-54600, Pakistan.

Telephone & Fax: 042-35866859
E.mail: mashbks@brain.net.pk
http://www.mashalbooks.com

MashalBooks.com

یورپ امیر کیسے بنا

لیورہیوبرمین　　ترجمہ تلخیص: عبداللہ ملک

آخر ملک امیر کیوں ہیں اور کچھ ملک مستقل غربت میں کیوں پھنسے ہوئے ہیں؟ ایک زمانہ تھا کہ یورپ بھی نہایت پس ماندہ ملک تھا۔ پھر کیا ہوا کہ یورپ نے اتنی زبردست ترقی کر لی؟ اس معاملے کو سمجھنا ہم جیسے تیسری دُنیا کے مالک کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ ''یورپ امیر کیسے بنا'' میں سرمایہ داروی نظام کے آغاز اور عروج کی جو کہانی بیان کی گئی ہے وہ اتنی ہی دلچسپ ہے جتنی سبق آموز ہے۔ اس کہانی میں اگر ایک طرف ابھرتی ہوئی سرمایہ دار طاقتوں کی کارجوئی اور نئے نئے طریقے تلاش کرنے کے عزم کی داستان ہے تو دوسری طرف جبر و استحصال کی تصویر بھی ہے۔ اور یہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے.....

MashalBooks.com

فہرست

دیباچہ
(۱) پروہت، سورما اور کاشتکار
(۲) یورپ جاگتا ہے
(۳) شہر نمودار ہوتے ہیں
(۴) نئے خیالات کی آمد آمد
(۵) دہقان اپنی غلامی کی زنجیریں توڑتا ہے
(۶) دستکاروں کی انجمنیں
(۷) یورپ میں قومیں ابھرتی ہیں
(۸) ''امیر لوگ.....''
(۹) ''غریب لوگ، فقیر لوگ، اور چور!
(۹) مزدوروں کی ضرورت ہے
(۱۰) دو سال کی عمر والے بھی درخواست دے سکتے ہیں
(۱۱) سونا شان اور سرخروئی
(۱۲) ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو!
(۱۳) پرانے نظام کا خاتمہ
(۱۴) سرمایہ داری نظام اپنے قدم جماتا ہے
(۱۵) بوئے اور، کاٹے کوئی اور
(۱۶) آزاد تجارت..... خدا حافظ!
(۱۷) اب کارل مارکس آتا ہے
(۱۸) ٹرسٹ اور کارٹیل سے سامراج تک

MashalBooks.com

دیباچہ

دنیا کی پہلی سوشلسٹ ریاست کے بکھر جانے کے ساتھ ہی دنیا بھر میں مارکیٹ اکانومی کے نام پر سرمایہ دارانہ نظام اور اس کی خوبیوں اور برکات کا جو چرچا آج کل جاری ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ بات بڑی دلچسپ معلوم ہوتی ہے کہ کسی نے لیوہیوبرمین کی کتاب Man's Worldly Goods کے ترجمے کی اشاعت کا فیصلہ کیا۔ خود ہمارے ملک میں نج کاری اور مقامی اور غیر ملکی سرمایہ کاری کے حوالہ سے جو کوششیں ہو رہی ہیں ان سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکثر دانشوروں، معیشت دانوں اور سیاست کاروں نے سرمایہ داری نظام کو بہترین اور فطری سماج کے طور پر قبول کر لیا ہے اور یہ بھی طے کر لیا ہے کہ ذرائع پیداوار کی اجتماعی ملکیت منصوبہ بندی کی معیشت اور پبلک سیکٹر کے تصورات ناکام ہو چکے ہیں اور ان کے حوالے سے کسی جدید اور ترقی یافتہ سماج کی تعمیر ممکن نہیں۔ یقیناً لیوہیوبرمین کی زیر نظر تصنیف کو از سر نو منظر عام پر لانے کا اس سے بہتر کوئی اور وقت نہ ہو سکتا تھا۔ اس کتاب کا موضوع ہی یورپ میں سرمایہ دارانہ نظام کا آغاز اور نشوونما کی تاریخ مرتب کرنا ہے۔

قرون وسطی کے یورپ کا جاگیرداری عہد جس جبر سماجی ظلم اور تہذیبی سڑاند سے دوچار تھا اس نے کسانوں' زمین سے بندھے ہوئے کاشتکاروں اور نچلے طبقے کے دیگر لوگوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ صورت حال سماجی بے چینی اور طبقاتی کشمکش کی شکل اختیار کرتی گئی۔ یورپ کے مختلف ممالک میں کسانوں کی بغاوتیں اسی کشمکش کا اظہار کرتی ہیں۔ اس طبقاتی جدل میں جاگیردار اکیلا ہی ظالم نہ تھا۔ بادشاہ اور چرچ دونوں ہی اس نظام کے پشت پناہ تھے۔ مذہبی تاویلات کے ذریعہ مالک کے حق کو برتر اور عین منشاء خداوندی ثابت کرنا چرچ کے فریضہ میں شامل تھا۔ درحقیقت چرچ خود بڑی بڑی جاگیروں کا مالک تھا اور اسی لئے اس نظام کا تحفظ اس کے مذہب کی ضرورت بن گیا۔ اسی زمانے میں دستکاریاں اور حرفت اور اس کے ساتھ ساتھ تجارت میں جو بتدریج اضافہ ہوا۔ اس نے بیک وقت کئی تقاضے ابھار دیئے۔ مصنوعات کی تخلیق کے نت نئے طریقے ایجاد کرنا' تجارت کے لئے منڈی کا حصول اور بڑھتی ہوئی حرفت اور تجارت کے لئے افرادی قوت کی ضرورت اس نئے طبقے کی ضروریات میں شامل تھا۔ اسی کے ساتھ سرمایہ بھی اکٹھا ہوتا گیا اور سرمایہ کاری رفتہ رفتہ نئے نظام کی بنیاد مرتب کرنے لگی۔ سمندری مہمات

امریکہ اور ہندوستان تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش اس نئی صورت حال کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اشیاء کے تبادلے کے ذریعہ تجارت کا روج ختم ہو چکا تھا اور سکہ ذریعہ مبادلہ بن چکا تھا۔ سونا اور چاندی اب ایک نئی اہمیت اختیار کر چکے تھے اور اسی لئے ان کی تلاش میں نئی سے نئی دنیا دریافت کرنا از بس ضروری ہو گیا تھا۔ سرمائے یا زر کی اس بڑھتی ہوئی اہمیت نے کئی حکمرانوں اور بادشاہوں کو اپنے مروجہ جاگیرداری رشتوں سے آگے بڑھ کر سرمایہ کاری کی طرف راغب کیا۔ ایسی کمپنیاں وجود میں آئیں جو انگلستان، ہالینڈ، فرانس، سویڈن اور ڈنمارک میں قائم ہوئیں اور سترھیوں صدی کے آغاز تک زر کا یہ نظام ایک نئے معاشی نظام کے طور پر یورپ میں بین الاقوامی شکل اختیار کر چکا تھا۔ تاہم یہ سارے کا سارا عمل نہ تو اتنا پر امن تھا اور نہ ہی اتنے مختصر وقت پر محیط جیسا کہ ان چند سطور سے ظاہر ہوتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سلسلہ تین چار صدیوں پر محیط ہے اور ظلم اور تشدد اور انسانیت سوزی کے لاتعداد مظاہر سے بھرا پڑا ہے۔ وہ جنگیں جنہیں ''صلیبی'' کہا گیا در حقیقت تجارتی مقاصد اور تجارتی راستوں پر دسترس رکھنے سے گہرا تعلق رکھتی تھیں۔ گویا مذاہب نے براہ راست اس عمل میں حصہ لیا۔ مذہب کا استعمال اور بھی کئی شکلوں میں ہوا۔ سرمائے کے آغاز کے ساتھ ہی سود کا تصور بھی پیدا ہو گیا تھا۔ چرچ جو رائج الوقت جاگیردارنہ نظام کا حصہ اور اس کا پشت پناہ تھا نئے تاجروں کی پھیلتی ہوئی طاقت اور ان کے سرمائے کی بڑھتی ہوئی اہمیت سے خائف تھا۔ سود خوری کے خلاف زبردست تحریک جاری کی گئی جس میں ایک طرف چرچ شامل تھا جو فتوے صادر کر رہا تھا اور دوسری طرف وہ بادشاہ شامل تھے جو ابھی براہ راست نئے نظام میں ملوث نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ سود خوری کے خلاف قوانین وضع کئے گئے۔ ہمارے ملک میں اس وقت جو کشمکش مذہبی بنیاد پرستوں اور حکمران طبقے کے اس حصے کے درمیان جاری ہے براہ راست یا بالواسطہ سرمایہ کاری سے متعلق ہے وہ نہ تو ہمارے مذہب کی کسی خصوصی تاویل کا نتیجہ ہے اور نہ ہی ایسا پہلی مرتبہ ہو رہا ہے۔ مذہب کی نت نئی تاویلات نئے فرقوں کی تخلیق، حتیٰ کہ نئے مذاہب کا جنم لینا تاریخ انسانی کے مختلف ادوار میں اپنے مخصوص معروضی تقاضوں اور پیداواری رشتوں پر مبنی رہا ہے۔ یورپ میں چرچ آف روم اور کیتھولک نقطۂ نظر سے بغاوت اور پروٹسٹنٹ ازم کی داغ بیل کو اسی تناظر میں سمجھا جا سکتا ہے جو یورپ میں ٹوٹتے ہوئے جاگیردارنہ نظام اور ابھرتے ہوئے تاجرانہ اور صنعتی نظام کی کشمکش نے مرتب کیا۔ اگر ہم اس سے پیچھے چلے جائیں تو عہد غلامی کے مذاہب یعنی ''یہودیت'' اور ''مسیحیت'' کی تعلیمات کو

براہ راست اس عہد کی اس کشمکش کے حوالے سے سمجھا جاسکتا ہے جو غلامی کے نظام کے خلاف غلاموں کی بغاوتوں کی صورت میں جاری تھیں تصوف کی مسلک' صوفیا کے نظری اور عملی کردار 'ہندوستان میں بھگتی تحریک کا احیاء اپنے عہد کے جابرانہ سماجی نظام اور اس کی پشت پناہی کرنے والے مذہبی خیالات کے خلاف ردعمل تھا اور یہ عمل محض خیال کی دنیا میں نہیں تھا بلکہ درحقیقت خود سماج کے اندر ظالم اور مظلوم کے درمیان کشمکش سے مرتب ہوا تھا۔

سرمایہ دارانہ نظام کی ترویج کے دوران بیک وقت ایک سے زیادہ رجحانات سماج کے اندر موجود رہے ہیں۔ وہ رجحانات جو نئے تاجر اور صنعتی طبقے کو مروجہ جاگیردارانہ نظام کو پسپا کر کے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے اور بالاخر ریاستی نظام پر قابض ہونے کا راستہ دکھاتے تھے' اور وہ رجحانات جو مروجہ نظام اس نئے نظام پر قابض ہونے کا راستہ دکھاتے تھے، اور وہ رجحانات جو نظام کی مزاحمت میں پیش کرتا تھا، اور پھر وہ رجحانات جو نیا نظام اپنی نشوونما، ترویج اور پھیلاؤ کے لئے ظلم اور طاقت کے نئے حربوں کے حوالے سے تخلیق کر رہا تھا۔ غلاموں کی خرید و فروخت عہد غلامی کے ختم ہونے کے کئی سو سال بعد یورپ میں رائج ہوئی جب نئی دنیائیں دریافت ہوئیں ،تجارت کو وسعت حاصل ہوئی اور اور نیا طبقہ مستحکم ہونے لگا۔ نئی دنیاؤں میں ظلم و جبر کی ایک نئی داستان لکھی گئی۔ براعظم امریکہ میں مقامی آبادی کا تہ و تیغ کرنا، براعظم افریقہ سے غلاموں کی بر آمد اور نیم براعظم امریکہ میں نوآبادیاتی نظام کی گرفت اور مقامی آزادی کا خاتمہ، یہ سب صنعتی سرمایہ داری کے فروغ کے اس عہد سے تعلق رکھتے ہیں جب سرمایہ ایک ملک سے کر برآمد ہو کر دوسرے ملکوں پر حاوی ہونے لگا۔ یہ نوآبادیاتی نظام کی ابتداء تھی۔

تاجرانا سرمایہ داری سے صنعتی سرمایہ داری کا سفر جہاں ایک طرف سماجی ظلم پر مبنی ہے وہیں نظریات میں ایک نفسیاتی تبدیلی کا بھی عہد ہے۔ یہ تبدیلی صنعت کی ایجاد یا صنعتی انقلاب کی مرہون منت ہے۔ لیکن پہلے کچھ ظلم و تشدد کا حوالہ۔ شیلے کی ایک مشہور نظم ''انگلستان کے باسیوں سے خطاب'' ایک ہی وقت میں ٹوٹتے ہوئے جاگیردارانہ نظام کے مظالم اور نئے صنعتی نظام کے جبر کا اس طرح اظہار کرتی ہے:

''انگلستان کے باشندو تم کس کے لئے ہل چلاتے ہو؟
اس مالک کے لئے جو تمہاری پستی اور تباہی کا ذمہ دار ہے؟
کیا تم اس لئے محنت اور ہنرمندی سے کپڑا بنتے ہو

کہ ظالم دولت منداس سے پوشاکیں بنا کر پہنے؟
تم کس لئے مہد سے لیکر لحد تک کھلاتے، پہناتے اور بچاتے رہتے ہو
ان ناشکرے مفت خوروں کو جو تمہارا پسینہ نہیں خون چوستے ہیں؟

--

''فصل بوتے تم ہو، کاٹتا ہے کوئی اور
دولت نکالتے تم ہو بٹورتا ہے کوئی اور
لباس تم بنتے ہو پہنتا ہے کوئی اور
ہتھیار تم ڈھالتے ہو اٹھاتا ہے کوئی اور۔
بیج بوؤ پر کسی ظالم کو فصل مت کاٹنے دو
دولت بناؤ پر کسی مکار کو اکٹھا مت کرنے دو
پوشاکیں بنو پر کسی کاہل کو مت پہننے دو
ہتھیار ڈالو پر اپنی حفاظت کے لئے--خود پہنو۔۔۔

شیلے کی نظم کی آخری سطور کے خلاف جو آواز بلند ہے یہ اس طبقاتی کشمکش کا اظہار کرتی ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے فطری تضادات کا نتیجہ ہے۔ یہی تضادات بعد ازاں محنت کشوں کی تحریکات کی صورت میں منظّم ہوئے۔ سرمایہ دارنہ نظام کا ابھار، اس کے تضادات اور اس کی اگلی شکل ہی ہیوبرمین کی کتاب کا موضع ہے۔ اس کے اپنے الفاظ میں یہ کتاب تاریخ کو معیشت کے حوالے سے اور معیشت کو تاریخ کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی سائنسی تحقیق اور پھر اس کے حوالے سے انسان کی عہد بہ عہد کی سماجی تاریخ کا مطالعہ کارل مارکس کے نظریہ قدر زائد کو تشکیل دیتا ہے اور انسانی سماج کو اس کے مختلف طبقاتی ادوار کے حوالے سے سمجھنے کا کام تاریخ کے جدلیاتی نقطۂ نظر کے فلسفے کو تخلیق کرتا ہے۔ مارکسزم کا یہ ہمہ گیر نقطۂ سماج کی تبدیلی میں طبقات اور ان کے مابین کشمکش، آلات پیداوار کی تبدیلی اور ان کے ساتھ پیداواری رشتوں کے بدلنے کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ مارکسی منطق کے مطابق سماجی تبدیلی کا یہ عمل سرمایہ داری نظام پر منتج نہیں ہوتا۔ بلکہ سرمایہ داری نظام کی کوکھ سے پیدا ہونے والے تضادات اور اس سے جنم لینے والی طبقاتی کشمکش کے نتیجہ میں ایک نئے سماج کی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ مارکس کے مطابق یہ سماج بتدریج بالادست اور زیردست طبقات کے خاتمے اور ایک غیر طبقاتی سماج کی

تشکیل کی صورت میں پیدا ہونا یقینی ہے۔ ایک دوسری سطح پر ہیوبرمین کی تصنیف یورپ میں سرمایہ دارانہ نظام کی تشکیل، اس کے تضادات اور اس کے نتیجہ میں ایک نئے سماج کی تشکیل کی کہانی ہے۔ یہ نیا سماج 1917ء کے انقلاب میں روس کے نتیجہ میں تشکیل پانے والے معاشی اور سماجی رشتوں کے حوالے سے ابھرتا ہے اور یہی ہیوبرمین کی کتاب کا آخری باب ہے۔

ہیوبرمین کی کتاب کا موجودہ ترجمہ درحقیقت صرف ترجمہ نہیں ہے۔ عبداللہ ملک نے ہیوبرمین کی کتاب کو بنیاد بنا کر قریب قریب ایک تخلیقی عمل کیا ہے۔ ہمارے عہد میں ایسی کتاب کی آج شدت سے ضرورت تھی جو سرمایہ داری نظام اور اس کے استحصالی عنصر اور تضادات کی بنیاد پر اس کی حقیقی سرشت کی تصویر کشی کرے۔ اس کتاب کی یہ اہمیت بھی ہے کہ (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) یہ معیشت کو تاریخ کے حوالے سے اور تاریخ کو معیشت کے حوالے سے سمجھنے کے رجحانات کو مضبوط کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی طریقہ کار سائنٹفک ہے اور آج ہمیں از سرنو سائنٹفک نقطہ نظر اور روشن خیالی کو ایک زبردست تحریک کی صورت میں ابھارنے کی ضروری ہے۔

عابد حسن منٹو

لاہور

17 فروری 1993

MashalBooks.com

پروہت، سورما اور کاشت کار

پرانے دور کی فلموں میں عجیب وغریب مناظر میں آتے تھے۔ آج اگر ایسی فلمیں ہم دیکھیں تو مارے ہنسی کے ہمارے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔ اس زمانے کی فلموں میں فلموں کے ہیرو ٹیکسوں میں بے روک ٹوک گھومتے، خرید وفروخت کرتے، بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹورز میں جا گھستے یا کسی ہوٹل میں جا گھستے اور بے تحاشہ کھانا شروع کر دیتے۔ لیکن ان فلموں میں کبھی بھی کسی کردار کو ٹیکسی کا کرایہ ادا کرتے ہوئے یا کھانے کے پیسے دیتے ہوئے نہیں دکھایا گیا۔ غالباً معاوضہ دینا کوئی ضروری فعل تصور نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح ازمنہ وسطیٰ (400ء سے لے کر 1500ء تک کا زمانہ) سے متعلق کتابوں میں اس زمانے کی جو منظر کشی پڑھنے کو آج بھی اگر مل جاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم خوابوں کی دنیا میں رہ رہے ہیں۔ اس دور کے شہزادوں اور شہزادیوں کے زرق برق لباس، ان کے طرز بود وباش، ان کے فلک بوس محلات، کشادہ کمرے، نوکروں چاکروں کی ریل پیل، ان سب کی نقشہ کشی پر صفحات کے صفحات سیاہ کر دیئے جاتے، ان کے ہاں ان گنت کھانے، پھلوں کی افراط، زندگی کے ان تمام پہلوؤں کی تو خوب خوب نقشہ کشی ہوئی لیکن اس نقشہ کشی میں کہیں یہ بیان نظر نہ آتا کہ آخر یہ طرح طرح کے کھانے اور من وسلویٰ کہاں سے آتے تھے؟ آسمان سے تو یہ اترنے سے رہے۔ یہ فلک بوس محل اور ان کے کشادہ کمروں کو آخر کون تعمیر کرتا تھا؟ کہ زرق برق لباس کون تیار کرتا تھا؟ اسی طرح پادری، پروہت اور مولوی ملا تھے جو مرغن غذائیں حاصل کرتے تھے اور ان سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہ سب چیزیں کہاں سے آتی تھیں؟ مذہبی فرائض ادا کرنے والے تو عبادات اور دعاؤں کا فریضہ سرانجام دیتے تھے، اور بادشاہ اور ان کے سپہ سالار جنگ آزمائیوں میں مصروف رہتے تھے۔ چنانچہ ضرور ایک اور طبقہ تھا جو سامان آسائش پیدا کرتا تھا۔ لیکن عام طور پر پرانے دور کی منظر کشی میں اس طبقے کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔

دراصل ازمنہ وسطیٰ کا جاگیرداری سماج تین گروہوں اور طبقوں پر مشتمل تھا: عبادت کرنے والے لڑنے والے اور پیداواری عمل کو آگے بڑھانے والے۔ بنیادی طور پر یہ پیداواری عمل کو آگے بڑھانے والا طبقہ ہی تھا جو پہلے دو طبقوں کو کھلانے پلانے اور عیش وعشرت کے ذرائع مہیا کرنے کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ اس وقت اس پیداواری عمل کو آگے بڑھانے والے انسان کو

اپنی کیفیت کو پورا پورا ادراک نہیں تھا۔لیکن پھر بھی کچھ لوگ اس پورے مکروہ منظر سے آشنا تھے اور اس کی کراہت کو محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ کسی شاعر نے اسی زمانے میں کہا تھا۔

امرا اور پادری و پروہت یہ سب
ان کے سہارے جیتے ہیں جو کام کرتے ہیں

ازمنہ وسطیٰ کے جاگیرداری دور کے بارے میں غور کرتے ہوئے ایک سوال جو اہم ہے وہ یہ ہے کہ اس زمانے کا پیداواری عمل کس قسم کا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب پیداوار کا واحد منبع زرعی پیداوار تھی۔اس زمانے میں مشین ایجاد نہیں ہوئی تھی، گوزمین سے پیداوار حاصل کرنے کے لئے ہل وجود میں آچکا تھا۔سب سے اہم آلات پیداوار انسان، جانور اور ہل تھے۔ازمنہ وسطیٰ کے پیداواری عمل میں حصہ لینے والے زمینوں پر محنت کرتے تھے۔ زمین کی بوائی کرنا، فصلوں کو اگانا، جانوروں کی پرورش کرنا، ان جانوروں کی اون سے لباس تیار کرنا اور ان کے دودھ اور گوشت سے غذا تیار کرنا، ان محنت کرنے والے انسانوں کے ابتدائی اور بنیادی کام اس زمانے میں یہی ہوا کرتے تھے۔

زرعی اراضی کی نوعیت آج کے ترقی یافتہ ملکوں سے (جہاں بڑے بڑے فارمز پر کاشت کی جاتی ہے) مختلف تھی۔مثلاً مغربی اور وسطی یورپ کی زمینیں بہت سے قطعوں میں بٹی ہوتی تھیں۔یہ قطے تعلقہ یا جاگیر کہلاتے تھے ایک جاگیر ایک گاؤں اور اس سے متعلق سینکڑوں ایکڑ قابل کاشت اراضی پر مشتمل ہوتی تھی جس پر صرف وہ لوگ ہی کام کرتے تھے جو اس گاؤں میں آباد ہوتے تھے۔اس قابل کاشت زمین کے کنارے پر عام طور سے زیادہ تر سبزہ زار اراضی، اور بعض حصوں میں بنجر اراضی بھی ہوتی تھی، چراگاہیں بھی ہوتیں جن میں مویشیوں کے لئے چارہ وغیرہ بویا جاتا تھا ان کے علاوہ جنگلات بھی ہوتے تھے اور ان کی بہت حد تک حفاظت بھی کی جاتی تھی کیونکہ غذا کی تیاری اور یورپ کی سردی سے محفوظ رہنے کے لئے جنگلات کی لکڑی ایک نعمت غیر مترقبہ تصور ہوتی تھی ویسے اس زمانے کی جاگیریں قطعاً کوئی ایک قسم کی نہیں ہوتی تھیں۔ جاگیریں رقبے اور تنظیم کے لحاظ سے ایک دوسرے مختلف ہوتی تھیں، اس لئے اس دور میں جاگیروں کے کام کی پوری نوعیت کا کوئی صحیح اندازہ آج کے دور میں نہیں لگایا جاسکتا۔ نیز ان جاگیروں میں بسنے اور کام کرنے والوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت بھی اکثر مختلف ہوتی تھی۔بہر حال پھر بھی ان کے درمیان بنیادی قدریں مشترک ہوتی تھیں۔اس دور کے یورپ کی

جاگیرداری دور کی کی کچھ خصوصیات کے متعلق چند کہاوتیں زبان زدعام ہوگئی تھیں۔مثلاً کوئی زمین بغیر جاگیردار کے اور کوئی جاگیردار بغیر زمین کے نہیں ہوسکتا۔مزید براں اس دور کے جاگیردار بالعموم قلعہ نما محلوں یا بہت ہی محفوظ قسم کے فارموں میں رہائش پزیر ہوا کرتے تھے۔ان قلعہ نما محلوں میں جاگیردار بمعہ اپنے خاندان اور اپنے نوکروں اور خدمت گزارون کی فوج ظفر موج کے ساتھ رہتا تھا۔بہت سے جاگیردار تو سینکڑوں جاگیروں کے مالک ہوتے تھے اور اسی حساب سے ان کی رہائش گاہیں بھی ہوتی تھیں۔

جہاں تک ان جاگیروں پر واقع چراگاہوں، جنگلات اور افتادہ زمینوں کا تعلق ہوتا تھا وہ پورے گاؤں کے استعمال میں آتے تھے۔لیکن قابل کاشت اراضی دو حصوں میں بٹی ہوتی تھی۔عام طور پر زمین کا تہائی حصہ جاگیردار کی ملکیت خاص تصور ہوتا تھا۔زمین کے باقی حصے زمینداروں کو دے دیئے جاتے تھے اور یہی کاشت کار اصل کام کرنے والے ہوتے تھے۔

یورپکا جاگیرداری نظام مختلف ادوار سے گزرا ہے۔ابتدا میں کاشت کارون کی زمینیں جن پر وہ کام کرتے تھے کبھی ایک جگہ پر نہیں ہوتی تھیں بلکہ یہ ٹکڑے مختلف اطراف کے مختلف حصوں میں واقع ہوتے تھے۔حتیٰ کہ جاگیردار کی جو اراضی خود اس کے لیے ہوتی تھی وہ بھی کسی ایک ٹکڑے پر مشتمل نہیں ہوتی تھی بلکہ مختلف ٹکڑیوں میں بٹی ہوتی تھی۔لیکن آہستہ آہستہ یہ اراضی یکجا ہونے لگی کیونکہ ٹکڑوں اور پٹیوں میں تقسیم شدہ اراضی خاصی نقصان دہ تھی۔آکر کار چند صدیوں کے تجربے کے بعد اراضی کی تقسیم کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔

جاگیرداری کے ابتدائی دور میں تو جاگیرداروں کو زراعت کے متعلق کچھ بھی علم نہیں تھا ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس فصل کے بعد کس غلے کی کاشت زمین کی توانائی بڑھانے اور زمین کو کمزوری سے بچانے کے لئے زیادہ مفید ہے۔وہ صرف اتنا سمجھ سکے تھے کہ صرف ایک ہی طرف کے غلے کی ہر سال کاشت مفید نہیں ہوتی۔اس لئے وہ ہر سال ادل بدل کر کے مختلف فصلیں مختلف رقبوں میں بویا کرتے تھے۔اگر پہلے سال ''الف'' ٹکڑے میں گیہوں یا رائی کی کاشت کی جاتی تھی تو اسی کے ساتھ ''ب'' ٹکڑے میں جو بودی جاتی تھی، اور ''ج'' ٹکڑا اس سال خالی چھوڑ دیا جاتا۔یہ سبق بھی کاشت کاروں اور جاگیرداروں نے صدیوں کے تجربوں سے سیکھا تھا اس ضمن میں نہ تو کوئی استاد تھا نہ ہی رہنمائی کے لئے کوئی کتاب تھی۔یہ صرف تجربہ تھا جس سے ان کے ذہنوں نے فائدہ اٹھایا۔

MashalBooks.com

قدیم زمانے میں جاگیرداری نظام کی تنظیم دو اہم بنیادوں پر قائم تھی۔

اول قابل کاشت اراضی دو حصوں میں تقسیم کی جاتی، ایک حصہ جاگیردار کی ملکیت ہوتا تھا اور اسی کی منفعت کے لئے بویا جاتا تھا، دوسرا حصہ بہت سے کاشت کاروں میں تقسیم ہوتا تھا۔

دوئم، آج کی کاشت کاری کے دستور کے مطابق اس دور میں زرعی اراضی کو بیک وقت زیر کاشت نہیں لایا جاتا تھا، اس کو مختلف ٹکڑیوں اور پٹیوں میں کو کر کے مختلف اوقات میں بویا جاتا تھا اور اسی کے مطابق کٹائی ہوتی تھی۔ نیز بیگار کی رسم اس زمانے میں بھی تھی۔ مثال کے طور پر کاشت کار کو صرف اپنی زمین پر کاشت نہیں کرنی پڑتی تھی بلکہ اپنے جاگیردار کی اراضی پر بھی بغیر کسی معاوضے کے کام کرنا تھا

جہاں تک اس زمانے کے کاشت کاروں کا تعلق ہے تیسری دنیا کے آج کے کاشت کاروں سے ان کی حالت چنداں مختلف نہ تھی۔ ازمنہ وسطی میں کاشت کار گھاس پھونس کے بوسیدہ جھونپڑوں میں اپنی زندگی کے دن گذارنے پر مجبور تھے۔ یہ بے چارے کاشتکار اپنی دور افتادہ اور بکھری ہوئی اراضی پر (جو انگلستان میں اوسطاً پندرہ سے تیس ایکڑ تک ہوتی تھی، فرانس میں اوسطاً چالیس سے پچاس ایکڑ تک ہوتی تھی) دن رات کی انتھک محنت کے بعد بھی مشکل اتنا پیدا کر پاتے کہ جسم و جان کا تعلق کسی نہ کسی طرح باقی رکھ سکیں۔ اس کے باوجود اس کو جاگیردار کے فارم پر بغیر کسی معاوضہ کے ہفتہ میں دو تین دن محنت کرنی پڑتی۔ اس مستقل بیگار کے علاوہ فصل کی تیاری کے موقع پر اس کو سب سے پہلے جاگیردار کی فصل کاٹنا اور غلہ تیار کرنا پڑتا تھا۔ اگر مقامی بازار میں پیداوار کی فروخت کا وقت ہوتا تو کاشت کار کو سب سے پہلے جاگیردار کے غلے اور گھر میں تیار شدہ شراب کے مٹکوں کو بازار میں فرخت کے لئے لانا پڑتا۔ اگر راستے کی کوئی سڑک ٹوٹی ہوتی تو اس کو ٹھیک کرنے کا کام کاشت کار کا ہوتا تھا، اور اسی طرح اگر ندی نالوں کا پل ٹوٹ جاتا تو اس کی مرمت اور تعمیر بھی کاشت کار ہی کی ذمہ داری تھی۔

یورپ کے ازمنہ وسطیٰ کے جاگیرداری دور کی تصویر بے حد ہی بھیانک ضرور ہے لیکن تیسری دنیا کے اکثر ممالک میں آج بھی قریب یہی حالت ہے۔ ٹھیک ہے اتنا فرق ضرور پڑا ہے کہ اب تیسری دنیا کے اکثر ممالک میں کاشت کار اور زمیندار کے درمیان تعلقات کو قانون کے ماتحت کر دیا گیا ہے۔ لیکن تمام قوانین کے باوجود ہم روزمرہ دیکھتے ہیں کہ اب بھی راج، وڈیرے اور زمیندار کا ہی چلتا ہے اور پولیس، عدلیہ، محکمہ جات سب قوانین کی پوتھیوں کو ایک طرف رکھ

کے زمیندار اور وڈیرے کے مفاد کی حفاظت میں مصروف کار رہتے ہیں۔

یورپ کے جاگیرداری دور کا نقشہ بارہویں صدی کے ناول نگاروں نے اپنے اکثر ناولوں میں کھینچا ہے اور ان میں بتایا ہے کہ اس جاگیرداری میں خود جاگیردار ایک گونہ چھوٹا صنعت کار اور تاجر بھی بن جاتا تھا۔ چنانچہ اس نے آٹا پیسنے کی چکیاں لگا رکھی تھیں، انگور سے شراب نکالنے کے لئے بھٹیاں بھی بنا چھوڑی تھیں۔ اگر کاشت کار کو گیہوں بوانے ہوتے، انگور کا عرق نکلوانا ہوتا تو جاگیردار کی چکی کے سوا اسکے لئے کوئی دوسرا ٹھکانا نہ تھا اور کاشت کار کو اس صلح کے منہ مانگے دام دینے پڑتے۔ اسی صورت حال کا نقشہ ایک اہل قلم نے یوں کھینچا ہے:

''کسان اپنے انگوروں کے رس کا حق دار نہ تھا۔ اچھی غذا کا کوئی لقمہ اس کی قسمت میں نہ لکھا تھا۔ وہ بڑا خوش قسمت تھا اگر اسے کالی روٹی کے کچھ ٹکڑے، پنیر اور مکھن کے ساتھ حلق کے نیچے اتارنے کو میسر آجائیں''

اسی طرح ایک شاعر ہمیں بتاتا ہے کہ

''اگر اس کے پاس موٹی بطخیں اور مرغیاں ہیں
اگر اس کی ٹوکری میں سفید آٹے کے کیک ہیں
تو ان کا حقدار تو اس کا مالک ہے۔''

غلام اور سرف میں امتیاز

یورپ کی جاگیرداری کی نقشہ کشی کرنے والے مورخ اور تجزیہ نگار اس زمانے کے کاشت کار اور اس سے پہلے کے دور غلامی کے غلام کے بارے میں لکھتے ہیں، سوال کرتے ہیں کہ کیا اس وقت کا کاشت کار غلام تھا؟ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دور کے کاشت کار کو یورپ میں ''سرف (serf)'' کے نام سے پکارا جاتا جو لاطینی زبان کے لفظ سروس (servus) سے نکلا ہے اور جس کے معنے غلام کے ہیں لیکن غلام کا تصور جو ہمارے ذہن میں ہے اس دور کے سرف پر صادق نہیں آتا۔ اگر قرون وسطیٰ میں اخبارات کی اشاعت کا رواج ہو گیا ہوتا تو اس قسم کا اشتہار جو 1828 میں انگلستان کے اخبار charleton courier کے صفحات پر شائع ہوا قرون وسطیٰ کے اخبارات میں ہرگز نہ شائع ہوتا۔ یہ اشتہار یوں تھا:

''ایسا قیمتی خاندان جو شاید ہی کبھی فروخت کے لئے پیش کیا گیا ہو، ایک باورچی عورت عمر

25 سال، اس کی لڑکی عمر 14 سال اور ایک 18 سالہ نوجوان لڑکے پر مشتمل ہے۔ پورا خاندان یکجا بھی فروخت ہوسکتا ہے اور علیحدہ علیحدہ کر کے بھی۔۔۔ خریدار کی جیسی خواہش ہو۔''

ازمنہ وسطیٰ کے جاگیرداری دور میں سرف خاندان اور اس کے خاندان کے افراد الگ الگ فروخت نہیں کئے جاسکتے تھے۔ جاگیرداری دور کی تمام قباحتوں کے باوجود سرف خاندان کو اپنے کنبے کے افراد کو یکجا رکھنے کا پورا پورا حق تھا۔ اس کے مالک کی مرضی ان کے ساتھ رہنے کے حق میں خلل انداز نہیں ہوسکتی تھی، غلاموں کی طرح وہ مالک کی جائیداد کا کوئی ایسا جزو نہ تھا جسے ہر وقت ہر طرح اور ہر موقع پر بیچا اور خریدا جاسکتا ہو۔ سرف اپنی زمین کا ایک ایسا لازمی حصہ تھا جسے زمین سے الگ کر کے فروخت نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جاگیر کا مالک اپنی جاگیر کسی دوسرے کا نام منتقل کرسکتا تھا لیکن اس کا اثر سرف پر صرف اتنا ہی پڑتا تھا کہ وہ انتقال ملکیت کے ساتھ دوسرے مالک کی ماتحتی میں آجاتا تھا، لیکن اپنی زمین سے اس کا تعلق بدستور باقی رہتا تھا۔ یہ ایک اہم امتیاز تھا اور اس سے سرف کی حیثیت غلام کے مقابلے میں قدرے بہتر اور محفوظ ہوتی تھی۔ سرف کے ساتھ مالک کا برتاؤ کتنا ہی خراب ہوتا لیکن وہ ایک کنبے کا مالک ہوتا تھا۔ وہ گھر میں رہتا تھا اور اپنی زمین پر کام کرنے کا مجاز ہوتا تھا۔ سرف کی یہ بنیادی طور پر محفوظ حیثیت اس دور کے فاقہ کش آوارہ گردوں کے لئے قابل رشک ہوتی تھی۔ چنانچہ اکثر فاقہ کش، آوارہ گرد جو بظاہر بالکل آزاد ہوتے وہ خود بہ رضا و رغبت گلے میں رسی ڈال کر سر پر ایک پینی (penny) یعنی ایک روپے کا نذرانہ رکھ کر جاگیردار کے روبرو حاضر ہوتے اور اپنے کو سرف بنائے جانے کی التجا کرتے۔

سرفوں کی قسمیں

سرفوں کی بھی یورپی جاگیرداری کے دور میں کئی قسمیں ہوا کرتی تھیں۔ لیکن اتنا زمانہ گذر جانے کے بعد صحیح طور پر سرفوں کی مختلف اقسام کے درمیان امتیازی فرقوں کا پورا پتہ لگانا بہت دشوار ہے۔ کچھ ایسے سرف بھی تھے جو مستقل طور پر جاگیرداروں کے محلوں اور فارموں میں ہمیشہ کام کرتے رہتے تھے۔ یہ بہت غریب سرف ہوتے تھے اور ان کو بورڈرز (Bordars) کہتے تھے۔ گاؤں کے کنارے دو یا تین ایکڑ ان کی کل کائنات ہوتی تھی۔ سرفوں کی اور قسم کوٹرز (Cotters) کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ یہ غریب صرف ایک جھونپڑے کے سوا کوئی اور

ملکیت نہ رکھتے تھے اور صرف پیٹ کی روٹی کے سہارے پورے خاندان کے ساتھ جاگیردار کے زیرسایہ اپنی پوری زندگی بسر کردیتے تھے۔ان کا یہ سلسلہ نسل درنسل چلتا رہتا۔

سرفوں کی ایک اور قسم کو ولین (villein) کہا جاتا ہے۔یہ لوگ دوسرے بدقسمت سرفوں کے مقابلے میں زیادہ خوش قسمت بھی ہوتے تھے اور ترقی یافتہ بھی۔اس لئے ان کو کچھ معاشی آزادیاں بھی حاصل تھیں۔وہ اپنے کاروبار میں جاگیردار کے کچھ زیادہ پابند نہ تھے گو ان کے فرائض بھی مقرر تھے۔جاگیردار اپنی مرضی کے مطابق ان سے ہر کام لینے کا مجاز نہ تھا۔ان میں سے بعض تو فصلوں کی کٹائی کے وقت بھی معمول کی خدمات سے مستثنیٰ تھے۔کچھ ایسے بھی تھے جو کسی قسم کی خدمت کے پابند ہی نہ تھے بلکہ صرف اپنی پیداوار کا ایک حصہ جاگیردار کو ادا کیا کرتے تھے۔ان کے علاوہ کچھ ایسے لوگ یا اعلیٰ قسم کے سرف بھی تھے جو نہ کسی قسم کی خدمت انجام دیتے اور نہ ہی پیداوار کا کوئی حصہ مالک کی خدمت میں پیش کرتے بلکہ اس کی بجائے ایک مقررہ رقم نقدی کی صورت میں مالک کو ادا کرتے رہتے اور یہی وہ طریقہ تھا جو آہستہ آہستہ رائج ہوتا گیا۔

یورپ کا جاگیرداری نظام جو ہزار ہا برس پر محیط رہا ہے اس کا صحیح خاکہ اور تاریخ بیان کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔یہ نظام ہر جگہ یکساں نہ تھا۔مختلف جگہوں پر مختلف دستور رائج تھے ،لیکن پھر بھی غیر آزاد طبقوں کے حالات میں کچھ باتیں بنیادی طور پر مشترک تھیں۔مثلاً کسان کم وبیش ہر جگہ جاگیردار کے پابند تھے۔یہ خیال کہ کاشت کار صرف زمین کے مالک کے لئے زندہ ہے ایک مروجہ عقیدے کے طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔آقا اور سرف کے درمیان مساوات کا سوال کبھی پیدا نہیں ہوتا تھا، بلکہ سرف میں اور جاگیردار کے دوسرے جانوروں میں کوئی فرق نہ تھا۔گیارہویں صدی کے فرانس کا رائج الوقت سکہ سو (sou) کہلاتا اور گیارہویں صدی کے فرانس میں ایک گھوڑے کی قیمت ایک سو sou ہوتی تھی۔اسی طرح ایک سرف کی اوسط قیمت 38 سو ہوتی تھی اور جاگیردار کو جس طرح اپنے چوپائے گھوڑے کا نقصان محسوس ہوتا تھا اس سے بڑھ کر اس کو اپنے دوپاؤں والے گھوڑے، یعنی سرف کے مرجانے کا بھی قلق ہوتا تھا۔اسی لئے اس دور کے معاشرے میں کسی سرف کا زمین سے الگ ہو کر بکنا ممکن نہیں تھا اور اس کا کسی جاگیردار کی زمین سے فرار ہو جانا ناقابل معافی جرم تصور ہوتا تھا۔جاگیردار کی جو زمین اس کی کاشت میں ہوتی تھی اس ملکیت کو tenure کہتے تھے۔یہ بھی لاطینی زبان ہی کا لفظ تھا اور اس ملکیت میں سرف کی ملکیت بھی شامل ہوتی تھی۔اس لئے اگر کوئی سرف زمین پر سے بھاگ نکلنے کی کوشش

کرتا ہے اور پکڑ لیا جاتا تو اس کو سخت سے سخت سزا دی جاتی۔ چنانچہ بریڈفورڈ کی جاگیر کے مالک کی یادداشتیں جو 1349 سے 1358 کی دہائی پر مشتمل ہیں، ان میں درج ہے:

''ولیم چلڈ ینگ (william chidyong) کی لڑکی ایلس (allice) جو مالک کی لونڈی (bonded woman) ہے، آج کل یورک (york) میں رہتی ہے۔ اس لئے اس کو گرفتار کر کے ہمارے ہاں لایا جائے''

جاگیردار کے لئے اپنے سرفوں کی تعداد میں کمی کسی صورت میں بھی برداشت نہیں ہوتی تھی کیونکہ اس کے کام کاج اور پیداوار کے متاثر ہونے کا ڈر ہوتا تھا۔ اس لئے سرفوں کی آل اولاد کی شادیوں پر بھی پابندیاں عائد ہوتی تھیں اور وہ جاگیر کے باہر کسی دوسری جگہ مالک کی منظوری کے بغیر شادی نہیں کر سکتے تھے۔ کسی سرف کے مرنے کے بعد اس کا جائز وارث ایک خاص ٹیکس ادا کرنے کے بعد ہی اس کی ملکیت کا وارث بن سکتا تھا۔ اسی بریڈفورڈ کی جاگیردار کی یاداشت میں اس وراثتی ٹیکس کے متعلق ایک واقعہ درج ہے:

''روبرٹ ولدروجر ولدرچرڈ جس کے پاس مکان اور آٹھ ایکڑ اراضی – dage land bon تھی مر گیا ہے۔ اس کا بھائی اور وارث جون آیا ہے۔ جاگیر کے رواج کے مطابق 3 شلنگ وراثتی ٹیکس ادا کرے اور ملکیت پر تصرف حاصل کرے۔''

سماجی نظام

اس اقتباس میں رواج کا جو ذکر ہوا ہے یہ رواج دراصل اس دور کے قوانین کا مظہر تھے۔ ازمنہ وسطیٰ میں کوئی ایسی مرکزی مضبوط حکومتیں نہیں ہوا کرتی تھیں جو اس وقت کے سماجی نظام کے ہر پہلو پر حاوی ہوتیں۔ اس وقت کا پورا نظام نیچے سے اوپر تک چند پابندیوں اور خدمتوں پر منحصر تھا اور یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ جاگیرداری دور میں اراضی پر قبضے کے معنی یہ نہ تھے کہ کوئی آج کل کی طرح آزادی سے اس زمین پر جو چاہتا کرتا۔ بلکہ اس دور میں قبضہ نام تھا ان چند ذمہ داریوں کا جو جاگیردار کو بھی ایک خاص شخص کے مفاد کے لیے اپنے اوپر عائد کرنی پڑتی تھیں۔ ان ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برانہ ہو سکتا تو زمین اس سے واپس لے لی جاتی۔ سرف کے اوپر اپنے مالک کی خدمات کی ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں اور مالک جنگ کے زمانے میں اپنے سرفوں کی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ یہ تمام باتیں باہمی طور پر طے

MashalBooks.com

تھیں اور رواج کے بموجب ان پر عمل ہوتا تھا۔لیکن کبھی کبھی رواجوں کے خلاف مزاحمت بھی ہو تی اور پھر وقت کے ساتھ ان میں قطع و برید بھی ہوتی رہتی تھی ۔بہر حال یہ بہت کم ہوتا تھا۔دوسرفوں کے درمیان کے جھگڑے جاگیردار کی عدالت میں طے کئے جاتے اور اگر سرف اور جاگیردار میں کرئی نزاع پیدا ہوتا تو وہ بھی فیصلہ کے لئے جاگیردار ہی کے سامنے پیش ہوتا ۔ظاہر ہے اس کا فیصلہ بھی جاگیردار کے ہی حق میں ہوتا۔

اس دور کی یادداشتوں میں ہم کو ایسے وقعات بھی ملتے ہیں جن میں کسی جاگیردار نے بعض رواجوں کو توڑا تو اس کو اپنے اوپر کے اعلیٰ جاگیردار کے سامنے پیش ہونا پڑتا۔اکثر اوقات کاشت کاروں کی شکایتیں بادشاہ کے دربار تک پہنچتیں اور وہاں ان کی شنوائی بھی ہوتی تھی ۔لیکن جب دو جاگیرداروں کے درمیان نزا پیدا ہوتا تب کیا ہوتا تھا؟اس سوال کے جواب کے مطالعہ میں ایک عجیب وغریب حقیقت کا اظہار ہوتا ہے(اور وہ حقیقت ہمارے ہاں کی (یعنی پاک وہند کی) کی پرانی تاریخ کے بہت ہی قریب دکھائی دیتی ہے۔یعنی جاگیردار عملاً سرفوں کی طرح اپنی زمین کا حتمی مالک تصور نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ بھی ایک بڑے جاگیردار کے سامنے ایک سرف کی حیثیت رکھتا تھا ۔سرف،ولین یا آزاد کاشت کار جاگیردار سے زمین حاصل کرتے تھے۔وہ جاگیردار ایک امیر کاؤنٹ کی طرف سے اپنی جاگیر کا مالک بنتا تھا اور یہ امیر کاؤنٹ کسی ڈیوک سے جاگیر کا فرمان حاصل کرتا تھا۔سب سے اوپر بادشاہ ہوتا تھا جو ڈیوک کا بھی حاکم ہوتا تھا ۔بعض دفعہ خود بادشاہ کسی بڑے شہنشاہ کا تابع یا تاج گزار ہوتا۔اس پورے سلسلہ کا اندازہ انگلستان کے 1279 کے عدالتی ریکارڈ سے لگایا جاسکتا ہے،اس ریکارڈ میں کہا گیا ہے:

''سینٹ جرمین (st.germain) کا روجر بیدفورڈ کے روبرٹ کی طرف سے ایک قطعہ اراضی پر قابض ہے اور اس کے لئے 3 پنس روبرٹ کو جس سے اس نے اراضی حاصل کی ادا کرتا ہے اور 6 پنس رچرڈ بلچسٹر کو روبرٹ کی طرف سے جس نے اس سے زمین حاصل کی ادا کرتا ہے۔رچرڈ مذکور نے یہ زمین الین دی شارتر (allaine de chaters) سے دو پنس سالانہ کے معاوضہ پر حاصل کی ہے۔الین اس زمین پر ولیم دی بتلر کی طرف سے قابض ہوا ہے اور ولیم مذکور نے یہ زمین لارڈ گیبر نیول سے حاصل کی ہے اور لارڈ گیبر نے لیڈی ور جیلا دی بارلاتل سے لی ہے اور لیڈی ور جیلا شاہ سکاٹ لینڈ کی طرف سے اس اراضی پر متصرف ہوئی تھی اور شاہ سکاٹ لینڈ کو شہنشاہ انگلستان نے یہ اراضی عطا کی تھی۔''

(یہاں ایک بات واضح کرنا ضروری ہے۔ازمنہ وسطیٰ کے ہندوستان میں اور یورپ میں ایک نہایت اہم فرق تھا۔جبکہ یورپ میں بادشاہ برائے نام پوری مملکت کا مالک سمجھا جاتا تھا، بر صغیر میں شہنشاہ پوری اراضی کا واقعی مالک ہوتا تھا۔یہ صحیح ہے کہ یورپ میں بھی جو لوگ براہ راست بادشاہ سے اراضی حاصل کرتے تھے خواہ وہ امرا کے طبقے سے تعلق رکھتے ہوں یا معمولی آزاد آدمی ہوں وہ لگان دار خاص یعنی tenant-in-chief کہلاتے تھے،لیکن حقیقی طور پر بادشاہ زمینداروں میں سے ایک تھا اور اس لئے وہ ساری اراضی کا اکیلا مالک نہیں تھا۔ع۔م)

وقت کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی جاگیریں اور جائیدادیں ٹوٹ ٹوٹ کر چھوٹی چھوٹی جاگیروں میں تقسیم ہوتی گئیں یہ جاگیریں کبھی ایک طبقے کے امیروں کے تصرف میں ہوتی تھیں اور کبھی کسی دوسرے طبقے کے قبضے میں آجاتی تھیں۔یہ اس لئے ہوتا تھا کہ ہر امیر اپنے حلقہ اثر کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنا چاہتا تھا،اور اپنے حلقہ بگوش افراد میں اضافہ کے لئے اسے اپنی اراضی کا کچھ حصہ ان وفاداروں کو دینا ہوتا تھا۔اس طرح جیسے جیسے کسی جاگیردار کی سیاسی طاقت بڑھتی ویسے ویسے اس کی اپنی جاگیر محدود ہوتی جاتی تھی۔اس کا اندازہ ایک فرانسیسی پرانی یاداشت سے ،جو 1200 کے سال میں رقم کی گئی تھی،لگایا جاسکتا ہے:

''میں تھیسالٹ (Thiebault) ٹروس (Troyse) کا کاؤنٹ موجودہ نسل اور اس کے آنے والی نسل کو مطلع کرتا ہوں کہ میں جوسلن دی اوالون (Jocelyn D.valon) اور اس کے ورثا کو بطور صلہ خدمت گلن کورٹ (gilin Court) کی جاگیر عطا کرتا ہوں۔جوسلن اس جاگیر پر متصرف ہونے کی وجہ سے ہمارے وابستگان دولت میں شمار ہوگا۔''

وابستہ دولت شخص (Liege man) ہونے کی حیثیت سے جوسلن سے غالباً یہ توقع ضرور کی جاتی ہوگی کہ وہ ضرورت کے وقت اپنے آقا کی فوجی خدمت سے گریز نہیں کرے گا۔بہت ممکن ہے اس کو مسلح سپاہیوں کی کوئی خاص تعداد کچھ معین وقت کے لئے آقا کی خدمت میں حاضر رکھنی پڑتی ہو۔ایک امیر (knight) کو انگلستان اور فرانس میں عام طور سے چالیس دن کی خدمات ادا کرنی پڑتی تھیں۔لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ یہ خدمات کسی خاص معاہدے کے تحت آدھی یا چوتھائی کردی جاتیں۔1272 میں شاہ فرانس کو ایک جنگ لڑنی پڑی۔اس نے ان امیروں کو جو فوجی خدمات کے لئے جاگیروں پر قابض تھے فوج میں شرکت کے لئے طلب کیا۔بعض امیروں نے پوری مدت فوجی خدمات انجام دیں لیکن کچھ جاگیرداروں نے اپنے قائم مقام بھیج

دیئے، چنانچہ اس زمانے کی ایک یادداشت میں کہا گیا ہے:

''امیر ریجنلڈ ٹرین (Reginald Krian,Knight) خود حاضر ہو کر فوج میں شامل ہوا۔ امیر ولیم دی کولنرز نے اپنی جگہ ٹومس شو کے (Thamas Choquet) کو دس روز کے لئے بھیجا۔ امیر جان ڈی شاتیلو نے حاضر ہو کر بیان کیا امیر گوداردس روز اپنی طرف سے دس دن تک جنگ میں شرکت کرے گا اور پھر امیر گوداردس دی گوداردو یئے (Godardus De king،Godardville) کی طرف سے، جس کو چالیس روز خدمات انجام دینی ہیں، شریک ہوگا۔''

''ادھر پاک و ہند کے برصغیر میں مغلوں نے جو منصب داری نظام رائج کیا اس کے تحت وہ جو جاگیریں عطا کرتے تھے اس میں وہ فوجوں کا تعین کر دیتے تھے اور اسی تعداد کی بنیادی پر ہی جاگیر اور منصب موسوم ہوتا۔ مثلاً پنج ہزاری ہفت ہزاری اور اس کا مطلب ہی یہ ہوتا تھا کہ یہ منصب اور جاگیر جو عطا کی جا کر رہی ہے اس کے صلے میں بادشاہ کو جو مالیہ ادا کیا جائے اس کے ساتھ ساتھ پانچ ہزار یا سات ہزار فوجی بھی تیار رکھے جائیں گے جو بوقت ضرورت جنگ میں شرکت کر سکیں گے۔ ع۔م)

یورپ میں جن امرا اور شہزادوں کو فوجی خدمات کے لئے زمینیں ملتی تھیں وہ آگے انہی شرائط پر زمین دوسروں کو عطا کر دیتے تھے۔ یہ درست ہے کہ حقوق و خدمات کی ظاہری نوعیت مختلف حصوں اور حالات میں بدلتی رہتی تھیں لیکن مغربی اور وسطی یورپ میں بنیادی طور پر ان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ان لوگوں کو جو ان زمینوں پر قابض ہوتے تھے اپنے مالک اعلیٰ کی رضامندی کے بغیر ان زمینوں کو فروخت کرنے کا اختیار نہ تھا۔ اگر ان کو انتقال اراضی کی اجازت مل جاتی تو وہ کچھ مطالبات ادا کرنے کے بعد اپنی اراضی کسی دوسرے کے نام منتقل کر سکتے تھے۔ جس طرح کسی سرف کے وارث کو ٹیکس کی ادائیگی کے بغیر متوفی کی جائیداد پر قبضہ نہ ملتا تھا اسی طرح کسی امیر کو بھی کسی جائیداد میں وارث کا حق حاصل کرنے کے لئے مالک اعلیٰ کو وراثت کا ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ اگر کوئی لگان دار فوت ہو جاتا اور اس کے وارث بالغ نہ ہوتے تو مالک اعلیٰ ان کے بلوغ تک جائیداد کا متولی رہتا تھا۔ اس لازمی تولیت کے لئے جس کا حق مالک اعلیٰ حاصل کرتا تھا یہ دلیل تھی کہ وہ ذمہ داریاں جن کی ادائیگی کے لئے متولی کو یہ زمین دی گئی تھی ان نابالغوں سے ادا نہ ہو سکیں گی اس لئے ان فرائض کی بجا آوری کے لئے مالک اعلیٰ انتظام سنبھالتا ہے۔ تولیت کے

اس زمانے میں جو کچھ آمدنی ہوتی تھی وہ مالک اعلیٰ کے تصرف میں آتی تھی۔

یہی نہیں بلکہ کسی جاگیردار کی وارث خواتین اپنی شادی کے لئے بھی مالک اعلیٰ کی منظوری اور مرضی کی پابند ہوتی تھیں، ایک کاؤنٹیس (countess) جس کا نام نرورس (Nervers) تھا اس نے 1221 میں اپنی یاداشت میں لکھا:

''میں متلدا (Matilda) نرورس کی کاؤنٹیس، ان سب کے سامنے جو اس تحریر کو پڑھیں گے، اعلان کرتی ہوں کہ میں نے مقدس صحیفوں کی قسم کھائی ہے کہ میں اپنے پیارے آقا فلپ کی خدمات تمام زندہ مردوں اور عورتوں کے خلاف بجالاؤں گی اور بغیر اس کی مظوری کے شادی نہیں کروں گی۔''

اگر کوئی بیوہ دوبارہ شادی کرنا چاہتی تھی تو اسے اپنے مالک اعلیٰ کو ایک ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ انگلستان کی ایک بیوہ لگان دار خاص کے بارے میں شاہ انگلستان نے 1316 عیسوی میں جو حکم نامہ جاری کیا تھا اس میں کہا گیا تھا:

''بادشاہ کی طرف سے تمام لوگوں کو مبارک ہو کہ جون (Joan) جو سائمن ڈارچس کی بیوہ ہے اور جس کا مرحوم میاں ولنگ فورڈ میں ہمارا لگان دار خاص تھا، اس کو ہم نے سو شلنگ کے ٹیکس کی وصولی کے بعد دوبارہ شادی کی اجازت دے دی ہے کہ وہ جس سے جی چاہے شادی کرلے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ جس شخص سے شادی کرے وہ ہمارا مطیع و فرمانبردار ہو۔''

لطف یہ ہے کہ اس دور میں اگر کوئی بیوہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی تو اسے شادی سے بچنے کے لئے مالک اعلیٰ کو ایک رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔ حسب ذیل تحریر سے اس کا ثبوت ملتا ہے:

''وارک (warwick) کی کاؤنٹس ایلس (Allice) ایک ہزار پاؤنڈ اور دس گھوڑے پیش کرتی ہے تاکہ اس کو بیوہ رہنے کی اجازت دی جائے اور اسے بادشاہ کی طرف سے دوسری شادی کے لئے مجبور نہ کیا جائے۔''

یہ وہ چند ذمہ داریاں تھیں جو حلقہ بگوشوں کو اس زمین اور حمایت کے عوض میں جو وہ مالک اعلیٰ سے حاصل کرتے تھے پوری کرنی پڑتی تھیں۔ ان حلقہ بگوشوں کے فرائض صرف ان ذمہ داریوں کی ادائیگی تک ہی محدود ہوتے تھے بلکہ اگر مالک اعلیٰ کہیں گرفتار ہو جاتا تو ان حلقہ بگوشوں کو زر فدیہ ادا کر کے اس کو رہا بھی کرانا پڑتا تھا۔ اگر مالک اعلیٰ کا لڑکا نائٹ (نواب) بنایا جاتا تو ان حلقہ بگوشوں پر لازم ہوتا تھا کہ وہ مالک اعلیٰ کی خدمت میں نذانے پیش کریں تاکہ اسی

خوشی ومسرت کے اظہار کے لئے جو تقاریب ہوں ان کے مصارف پورے کئے جاسکیں۔

1225 عیسوی کا واقعہ ہے کہ انگلستان میں ایک شخص بالڈون (Baldwin) نے ان روایتوں اور دستوروں کے خلاف آواز بلند کی اور کہا کہ شہزادہ جس کو نائٹ بنایا جارہا ہے وہ براہ راست میرا مالک اعلیٰ نہیں ہے اس لئے مجھے نذرانوں کی ادائیگی سے معاف رکھا جائے۔ بالڈون کی اس عذرداری کو منظور کرلیا گیا اور اس کو نذرانے کی رقم کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔اس واقعہ کے بارے میں یادداشت میں لکھا ہے:

''وارچسٹر (worchester) کے شیرف کو حکم دیا جاتا ہے کہ اگر بالڈون دی فری ول (Baldwian de freevil) اپنی زمین پر بادشاہ کی طرف سے متصرف نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اس کا دعویٰ ہے وہ اس زمین پر Alexender de Abetot کی طرف سے قابض ہے اور الکزینڈر کو اس زمین پر تصرف William de Beauchamp کی طرف سے ملا ہے اور ولیم، ورسٹر کے بشپ کی طرف سے قابض ہے اور بشپ نے یہ زمین بادشاہ سے کاشت کار خاص کے طور پر حاصل کی ہے۔اگر بالڈون کا یہ بیان صحیح ہے تو اس کو اس قرقی سے بری کیا جائے جو شاہزادے کے نائٹ بنائے جانے کے سلسلے میں امداد لینے کے لئے اس کے خلاف جاری کی گئی۔''

چرچ اور جاگیرداری

ان یادداشتوں سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کے جاگیرداری نظام میں سرف سے بادشاہ تک سینکڑوں کڑیاں ہوتی تھیں اور ان کڑیوں میں خود کلیسا یا چرچ بھی ایک کڑی ہوتا تھا۔ چرچ کے پاس بھی لاانداز اراضی ہوتی جو وہ آگے کاشت کے لئے منتقل کرتا رہتا۔بعض دفعہ چرچ کی جاگیر خود بادشاہ کی جاگیر کے برابر ہوتی اور ساتھ ہی چرچ کے تقدس کی وجہ سے چرچ کی اہمیت بادشاہ سے بھی بعض اوقات بڑھ جاتی۔ یہ مذہب کی بالادستی کا دور تھا اس لئے چرچ کے اثر ورسوخ کو کوئی انتہا نہ تھی۔لیکن چرچ کی دولت کی بنیاد اس زمانے کے دستور کے مطابق زمین ہی تھی۔زمین اس کے پاس کہاں سے آتی تھی؟ وہ جاگیردار جو تمام عمر گناہ کی زندگی بسر کرتے وہ موت کے قریب اپنے گناہ بخشوانے کے لئے چرچ کو زمینیں عطا کردیتے۔کچھ لوگ بیماریوں کی دیکھ بھال اور غریبوں کی خبر گیری کے لئے ہسپتال اور خیرات گاہیں تعمیر کرنے کے لئے چرچ کو رارضی اور نقدی فراہم کرتے۔(ہمارے ہاں کی طرح یہ زمینیں بھی وقف ہوا کرتی تھیں) اس

کے علاوہ امراء اور باشاہ جب کوئی نئی فتح حاصل کرتے تھے تو چرچ کو بھی مفتوح علاقوں میں حصہ دیتے تھے۔رفتہ رفتہ چرچ کی قلم رو بے پناہ وسعت اختیار کر گئی اور ایک دور تو ایسا بھی آیا جب مغربی یورپ کی تقریباً نصف زرعی اراضی چرچ کے تصرف میں آ گئی اور چرچ سب سے بڑا جاگیردار تصور ہونے لگا۔چنانچہ بشپ اور کلیسا کے سربراہ یعنی abbots بھی کاونٹوں اور ڈیوکوں کی طرح جاگیرداری نظام میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔اس بارے میں وہ فرمان جس کی رو سے بووے (Beauvvais) کے بشپ کو 1167 عیسوی میں جاگیر عطا ہوئی تھی اس کی عبارت توجہ طلب ہے:

''میں لوئی شاہ فرانس ان تمام لوگوں کے سامنے جو موجود ہیں اور جو آنے والے ہیں اعلان کرتا ہوں کہ ہمارے مانتے (Mante) میں شمپین (Champagane) کے کاونٹ ہنری نے ساوینی (Savigny) کی جائیداد بارے کے بشپ بارتھولیو (Bartholomew) کے اور اس کے جان نشینوں کے نام منتقل کی۔اس جاگیر کے لئے بشپ موصوف نے وعدہ کیا ہے اور ایک نائٹ مقرر کیا ہے تا کہ انصاف قائم رکھے اور کاؤنٹ ہنری کی مدد کرے۔اس نے وعدہ کیا ہے۔کہ اس کے بعد ہونے والے بشپ بھی اس معاہدے پر قائم رہیں گے۔''

چرچ جس طرح مالکان اعلیٰ سے زمین حاصل کرتی تھی اسی طرح وہ مالکان اعلیٰ کی حیثیت سے دوسروں کے نام زمینیں منتقل بھی کرتی تھی۔اس کے ثبوت میں ذیل کی تحریر کے لائق ہے:

''ایبٹ فاریٹیس (Fauritius) نے بھی ولیم مودوئی (William) Mauduit کے بیٹے روبرٹ کو ویسٹن (weston) میں اراضی جس کا رقبہ چار سو اسی ایکڑ ہے بطور جاگیردار عطا کی تھی اور اس کو پابند کیا گیا تھا کہ جب ایبنگڈن (Abingdon) کے چرچ کو نائٹ کی خدمات انجام دینی ہوں گی تو وہ نصف نائٹ کے فرائض چرچ کی طرف سے انجام دے گا۔''

جاگیرداری نظام کی ابتدا میں کلیسا اس دور کی سماج کا ایک ترقی پسند اور زندہ جزو تھا اس نے رومن تہذیب کی بڑی حد تک حفاظت کی،علوم وفنون کی ترقی اور اشاعت میں حصہ لیا۔اس مقصد کے لئے درسگاہیں قائم کیں،اس نے غریبوں کی مدد کی،یتیم خانوں کا انتظام کیا اور بیماروں کے لئے شفاخانے کھولے۔کلیسا کی ان خدمات پر نگاہ کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ کلیسا نے اس دور میں اپنے زیر تصرف ریاست کا انتظام اس دور کے بہت سارے دنیاوی

رئیسوں کے مقابلے میں بہت بہتر کیا۔لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے جس نے یورپ کے عیسائی سماج کو خاصا متاثر کیا۔مثلاً جبکہ عام امرا اپنے حلقہ بگوشوں کے تعداد بڑھانے کیلئے اپنی مقبوضہ جاگیروں کو بانٹتے اور ٹکڑے ٹکڑے کرتے تھے،ان کے مقابلے میں کلیسا کی ریاست کا رقبہ دن بدن بڑھتا اور پھیلتا جاتا تھا۔پادریوں کو شادی کی اجازت نہ تھی اس کی وجہ بھی غالباً یہی تھی کی اولاد پیدا ہونے سے کلیسا کی جائیداد آگے تقسیم نہ ہونی شروع ہو جائے۔کلیسا کی مقبوضہ اراضی میں اضافے کی ایک اور وجہ عشر (tithe) کی آمدنی تھی،اس کے مطابق ہر عیسائی کو اپنی آمدنی کا دسواں حصہ کلیسا کی نذر کرنا پڑتا تھا۔ایک مشہور مورخ اس عشر کے قانون اور رواج کے متعلق لکھتا ہے:

''عشر میں زمین،آمدنی اور موت کے ٹیکس شامل تھے۔موت کا ٹیکس ان تمام ٹیکسوں سے جن سے موجودہ زمانہ واقف ہے،زیادہ سخت تھا۔کاشت کار اور چھوٹے چھوٹے کاریگر اپنی آمدنی کا دسواں حصہ ادا کرنے پر مجبور تھے۔اون کا محصول بھی جانور کو پالنے والوں کو،خواہ ان کی ملکیت میں بطخوں کے سوا اور کچھ نہ ہو،ادا کرنا پڑتا تھا حتیٰ کہ گھاس بھی ٹیکس سے مستثنیٰ نہ تھی۔کسان جو کھیتی کے مصارف نکال کر صرف بچت پر دسواں حصہ کلیسا کو دیتا تھا اس کو عذاب جہنم کا مستحق قرار دیا جاتا کہ اس نے پوری کھیتی کی آمدنی پر دسواں حصہ کلیسا کو کیوں نہیں دیا!''

اس پورے عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسا کی دنیاوی دولت میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا گیا ویسے ویسے اس کی روحانی حیثیت روبہ زوال ہوتی گئی اور ان میں وہ سب آلائشیں گھر کرنے لگیں جو دنیادار جاگیرداروں میں تھیں۔اس دور کے مورخین کی بہت بڑی تعداد نے کلیسا کی قباحتوں کی نقشہ کشی کی ہے مثلاً:

> ''سینٹ لوئی (St.Louis) کے زمانے میں پیرس کے مشہور کلیسا نوترے دام کے پادریوں اور دیگر عہدے داروں نے اپنی اراضی کے سرفوں کو کچھ اس بری طرح لوٹا کہ خود ملکہ بلانش (Blanche) نے بہت ہی ادب اور احترام کے ساتھ کلیسا کی ان ظالمانہ حرکات کے خلاف احتجاج کیا۔لیکن کلیسا کی رعونت کا یہ عالم تھا کہ راہبوں نے لاپرواہی سے جواب دیا کہ ہم مختار ہیں اگر ہم چاہیں گے تو سرفوں کو بھوکوں بھی ماڈالیں گے۔''

جاگیرداری کے اس دور میں کلیسا اور ریاست کی ایک طرح سے مشترکہ حکمرانی تھی۔اگر

ریاست کے پاس دنیاوی قوت تھی تو کلیسا اس کو مذہب کے نام پر روحانی قوت مہیا کرتا تھا۔ لیکن اب اس گٹھ جوڑ میں ایک نیا عنصر داخل ہو رہا تھا۔ اس دور کے ایک مشہور مورخ بواسن وے (Boisson Way) نے اس کی نشاندہی اس طرح کی تھی:

''جاگیرداری سماج نے آخر کار ایسے نظام کا سہارا حاصل کیا جس نے عبادت اور مذاہب کے نام پر محنت کش طبقوں کو نکٹھو امرا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ (اور جب ان امرا پر برا وقت آیا تو) انہوں نے زمینوں کے ساتھ زمینوں پر محنت کرنے والوں کو بھی ایک اور طبقے کے حوالے کر دیا جو جاگیرداروں سے زمینیں چھیننے کی قدرت حاصل کر چکے تھے۔''

یہ طبقہ کون تھا؟ یہ طبقہ تاجروں کا طبقہ تھا، لیکن اس طبقے کی پیدائش اور اس کو پروان چڑھنے میں کئی صدیاں لگیں۔ ان کئی صدیوں کی جدوجہد ایک بڑی دلچسپ داستان ہے۔

یورپ جاگتا ہے

آج شاید ہی کوئی ایسا دولت مند آدمی ہو جو سونے اور چاندی کے سکوں سے اپنے صندوقوں کو بھرا رکھتا ہو۔ جن لوگوں کے پاس دولت ہے وہ اس کو اپنے پاس رکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کا سرمایہ اس کے لئے کچھ پیدا کرے اس لیے وہ اپنے روپے کے لئے نفع بخش ذرائع ڈھونڈتے ہیں، وہ ایسی جگہیں ڈھونڈتے ہیں، جہاں وہ اپنا روپیہ لگا کر اچھا نفع کمائیں۔ لیکن قرون وسطیٰ کے شروع کے دور میں (اور یہ پانچویں صدی سے لے کر تقریباً

گیارہویں صدی تک رہا) روپیہ سے نفع کمانے کے امکانات نہ تھے، لوگوں کے پاس استعمال کے لئے دولت بہت کم تھی۔ جن لوگوں کے پاس کچھ تھا وہ بھی اس سے بہت کم نفع اٹھا سکتے تھے۔ اہل کلیسا کی تجوریاں سونے چاندی سے اٹی پڑی تھیں۔ لیکن یہ سرمایہ جامد تھا، آجکل کی طرح متحرک نہ تھا۔ اس زمانے میں روپے سے دولت کمانے کے ذرائع ناپید تھے۔ اگر محصولات اور جرمانوں کے نام سے کوئی رقم ان کے پاس آتی تو وہ کہیں لگائی نہیں جاسکتی تھی جہاں سے امرا کو منافع حاصل ہو۔ غرضیکہ کلیسا کے پادریوں اور جنگ آزما امیروں کے پاس جتنی بھی دولت تھی وہ بے کار جامد اور غیر متحرک تھی۔

کیا اس زمانے میں روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں خریدنے کی حاجت نہ ہوتی تھی؟ نہیں، اس زمانے میں قریب قریب چیزوں کی خریداری کا رواج ہی نہیں تھا۔ تھوڑے سے نمک اور شاید کچھ لوہے کی ضرورت پڑتی ہو۔ دوسری چیزیں خاص طور پر غذا اور روزمرہ استعمال کے کپڑے مقامی گاؤں سے حاصل کر لئے جاتے۔ قدیم جاگیرداری نظام میں انسان کی معاشی زندگی روپے کے استعمال سے بے نیاز تھی ضرورت کی چیزوں کے معاملے میں ہر گاؤں خود کفیل ہوتا تھا اور اس دور میں سرف اور اس کے خاندان کے دوسرے افراد اپنی خوراک خود پیدا کرتے تھے۔ جس قسم کے فرنیچر کی ضرورت ہوتی تھی وہ اپنے ہاتھ سے بنا لیتے تھے۔ جاگیرداران سرفوں کو جو اچھے کاریگر ہوتے اپنے محل سے وابستہ کر لیتا اور وہ اس کی ضرورت کی چیزیں اس کی مرضی کے مطابق تیار کرتے رہتے۔ اس طرح ایک جاگیرداری گاؤں اپنی تمام ضروریات میں خود کفیل ہوتا۔ لیکن آہستہ آہستہ دیہات کی خود کفالتی کے باوجود اشیاء کے تبادلے کی ضرورت پڑنے لگی، اور اسی ضرورت نے ابتدائی تجارت کی بنیاد ڈالی جس کی بنیاد اشیاء کے تبادلے پر تھی۔ اشیاء کا یہ تبادلہ بڑی حد تک ان بازاروں میں ہوتا تھا جو ہفتہ میں ایک بار کسی خانقاہ، یا امیر کے محل کے باہر یا کہیں اور قرب وجوار میں لگا کرتے۔ ان بازاروں میں جاگیرداروں کے سرفوں کی پیدا کردہ فاضل پیداوار یا امرا اور جاگیردار کے اپنے کاریگروں کی تیار کی ہوئی فاضل چیزیں تبادلے کے لئے آتی تھیں۔ لیکن چونکہ ایک طرح ضرورت محدود تھیں اور دوسرے پیداوار بھی محدود تھیں، اس لئے تجارت اپنے محدود حلقے سے آگے نہ بڑھ پاتی تھی۔ ایک اور وجہ جو تجارت کی توسیع میں سب سے زیادہ حارج تھی وہ اس زمانے کی سڑکوں کی ناگفتہ بہ حالت تھی۔ پھر ڈاکوؤں اور راہزنوں کی فراوانی نے خود جاگیرداروں اور امراء کی اپنی زندگیاں اجیرن کر رکھی تھیں۔ ان حالات میں

تجارت کو کیا بڑھاوا مل سکتا تھا؟ اس کے علاوہ خود امراء اور جاگیردار قدم قدم پر جو محصول اور چونگی وصول کرتے تھے اس کی وجہ سے بھی اشیاء کو ایک گاؤں سے دوسری جگہ لے جانے میں لوگ ہچکچاتے تھے۔ اگر کوئی جاگیردار کسی سڑک پر سے محصول لئے بغیر گزرنے دیتا تو یہ حیران کن فعل تصور ہوتا چنانچہ ایک مصنف لکھتا ہے کہ

''جب تورس (Tours) کے شخص اودو (Odo) نے گیارہوں صدی عیسوی میں دریائے لوآر (Loire) پر پل تعمیر کرایا اور بلا کسی محصول کے ہر شخص کو اس کے استعمال کی اجازت دے دی تو اس نے عوام کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔''

تجارت کا فروغ نہ ہونے کی چند مزید وجوہات یہ تھیں کہ ایک طرف تو عام لوگوں کے پاس روپے کی کمی تھی، دوسری طرف ایک جاگیر سے دوسری جاگیر میں مختلف قسم کے سکے رائج تھے۔ اسی طرح ناپ تول کے پیمانوں میں بھی اختلاف تھا۔

لیکن گیارھوں صدی میں حالات میں تبدیلیاں آنے لگیں۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ یورپ کے لارڈز نے اپنی جاگیروں کا نظم ونسق بہتر کرنا شروع کر دیا تھا اور خاص کر ڈاکوؤں اور راہزنوں سے چھٹکارا حاصل کرنے پر توجہ دینا شروع کی۔ اس کے باعث لوگوں کو تحفظ ملا اور ان میں خود اعتمادی بڑھی جس کے نتیجہ پر ان کی معاشی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہوا۔

لیکن ان سرگرمیوں کو جس چیز نے خاص طور پر مہمیز لگائی وہ صلیبی جنگیں تھیں۔ صلیبی جنگیں گیارھویں صدی کے آخری دہائی میں شروع ہوئی تھیں اور بارھویں صدی میں جاری رہیں۔ ان جنگوں کا بظاہر مقصد مسلمانوں کے ہاتھوں سے بیت المقدس کو چھیننا تھا۔ فوجوں کی ضروریات کی فراہمی کے لیے تاجروں کا ایک طبقہ وجود میں آیا جو ضروریات کی اشیاء ساتھ لئے افواج کے ہمرکاب رہتا تھا۔ جب یہ عیسائی فوجیں مشرق میں پہنچیں تو انہوں نے وہاں ایک نئی دنیا دیکھی جس نے ان کی آنکھیں چندھیا دیں۔ چنانچہ جب یہ عیسائی محاربین اپنے اس ''مقدس'' سفر مشرق سے لوٹے تو وہ اپنے ساتھ عیش ونشاط کے روح افزا نظارے، الذیذ وخوش ذائقہ غذاؤں اور نفیس اور پر تکلف لباسوں کی ہوس بھی لائے۔ ان چیزوں کو انہوں نے اپنے سفر کے دوران دیکھا بھی تھا اور ان کو استعمال بھی کیا تھا۔ اب ان ہزاروں اور لاکھوں عیسائیوں کی ان نئی خواہشوں اور ضرورتوں نے یورپ میں مغربی ایشیا کی مصنوعات کے لئے ایک وسیع

بازار پیدا کر دیا۔

مسلمانوں کے خلاف بحیرہ روم میں سرحدی لڑائیوں اور مشرقی یورپ کے بعض قبائل کے خلاف جنگ آزمائیوں کو مذہبی جنگوں (Crusades) کے نام سے عزت بخشی گئی۔ حالانکہ در حقیقت یہ لڑائیاں محض لوٹ کھسوٹ اور مذید زمین کے حصول کے لئے لڑی گئی تھیں۔ کلیسا نے ان غارت گرانہ مہموں کو مذہبی زنگ دے کر بڑی شان سے عیسائی عوام کو جنگ کی آگ میں دھکیل دیا اور ایک جہاں کو یقین دلایا کہ یہ جنگیں کلمۃ الحق کے لئے اور کافروں کو تباہ کر کے بیت المقدس کو آزاد کرانے کے لئے لڑی جارہی ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ارض مقدس کی زیارت کا سلسلہ ایک عرصہ سے جاری تھا۔ آٹھویں صدی عیسوں سے دسویں صدی عیسوی تک چونتیس قافلوں نے اور گیارہویں صدی عیسوی میں ایک سوسترہ قافلوں نے ارض مقدس کی زیارت کی تھی۔ اس کے باوجود ارض مقدس کو مسلمانوں سے آزاد کرانے کی ضرورت پیش آئی اور یہ مہم نہایت خلوص کے ساتھ جاری رکھی گئی۔ یقیناً اس تحریک کے حامی و مددگار وہ لوگ بھی تھے جو مذہبی جذبہ سے سرشار تھے اور جنہیں ان محاذ آرائیوں سے کوئی ذاتی فائدہ نہ تھا۔ لیکن مجموعی طور پر اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جنگوں کی اصل قوت مذہبی جذبہ نہ تھا بلکہ بڑی حد تک اس منافع کی توقع تھی جو ان فتوحات سے بعض گروہوں اور بعض بادشاہوں کو حاصل ہونے والے تھے۔ ان گروہوں میں سب سے پیش پیش تو کلیسا تھا۔ کلیسا کو اپنی نیک نیتی میں شبہ نہیں تھا۔ اور وہ اس حقیقت سے بھی خوب واقف تھا کہ اس زمانے میں یورپ میں خانہ جنگیاں بہت ہو رہی تھیں۔ کلیسا نے اس فضا سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور کوشش کی کہ لڑنے والوں کی جنگ جوئی کا رخ ایسی زمینوں اور خطوں کی طرف پھیر دیا جائے جہاں کے لوگوں پر فتح حاصل کر کے ان کو عیسایت کے دائرہ میں شامل کیا جاسکے۔ 1095 عیسوی میں پوپ اربن دوئم (Urban II) فرانس کے شہر کلرموں (Clermont) میں عیسائی سے خطاب کرنے کے لئے آیا سو ایک شہری فلشر جو اس جلسے میں موجود تھا اس نے یورپ کی تقریر کا خلاصہ یوں اپنی یاداشت میں درج کیا ہے:

''جو لوگ ابھی تک آپس کی شیطانی لڑائیوں میں ایمان والوں کا خون بہاتے رہے ہیں ان کو اب کافروں کے مقابلے میں باہر نکالنا چاہئے۔ جو لوگ ابھی تک راہ زنی کرتے رہے ہیں ان کو اب سپہ گری کے جوہر دکھانے چاہئیں۔ جن کے ہاتھ ابھی تک اپنے بھائیوں اور عزیزوں کے خون سے رنگین رہے

ہیں ان کو اب اپنی تلواروں کا رخ وحشیوں کے سینوں کی طرف پھیر دینا چاہیے
جن لوگوں نے ابھی تک حقیر معارضوں کے لئے اپنا خون بہایا ہے اب ان
کو دائمی انعام کے لئے جدوجہد کرنی چاہیے۔''

دراصل کلیسا اپنے اقتدار کی توسیع کی فکر میں تھا۔ عیسایت دنیا کے جتنے حصے پر چھاتی کلیسا کے اقتدار کا حلقہ اتنا ہی وسیع ہوتا اور اس کی دولت کے وسائل میں بھی اتنا ہی اضافہ ہوتا تھا۔

دوسری قوت جس نے ان صلیبی جنگوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہ بازنطینی سلطنت اور بازنطینی کلیسا پر مشتمل تھی۔ اس کا صدر مقام قسطنطنیہ میں تھا۔ یہ شہر اسلامی خلافت کے ایشیائی مرکز سے بہت قریب تھا۔ بازنطینی بادشاہ اور کلیسا دراصل ان جنگوں کے ذریعے اپنے حلقہ اثر کو ایک طرف وسعت دینا چاہتے تھے تو دوسری طرف ان کو مسلمان قوت سے خطرہ بھی لاحق رہتا تھا اور وہ ان جنگوں کے ذریعے اسلامی فوجوں کو اپنی سلطنت سے دور رکھنا چاہیے تھے۔

ان دو قوتوں کے علاوہ اور بھی قوتیں ان صلیبی جنگوں کے لئے مصروف کار تھیں اور ان کے لئے فضا تیار کر رہی تھیں، ان میں ایک نمایاں قوت جاگیردار اور سرداروں کی تھی جو مال غنیمت کے بھوکے تھے۔ اس طبقے کو پورا یقین تھا کہ یہ صلیبی جنگیں ان کے لئے نئی جاگیروں اور بے اندازہ دولت کے حصول کے دروازے کھول دیں گی۔ ایک اور قوت جو ان جنگوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کیلئے بے تاب تھی وہ تاجروں کا وہ طبقہ تھا جو اطالوی شہر وینس، جنیوا اور پیسا میں آباد تھا۔ یہ شہر چونکہ سمندر اور دریاؤں کے کنارے آباد تھے اس لئے ان کو ایک طرح کی تجارتی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ اور اطالوی شہر وینس تو ویسے بھی اپنی جائے وقوع کی وجہ سے ہمیشہ ایک اہم مقام رہا ہے ایسے شہر میں جہاں نہریں سڑکوں کا کام کرتی ہوں وہاں بری اور بحری زندگی میں کوئی اتنا فرق نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے وینس کے باشندے بحری سفر میں بھی اتنے ہی ماہر تھے جتنا کہ بری سفر میں۔ چنانچہ اٹلی کے تجارتی شہروں نے صلیبی جنگوں سے خوب خوب تجارتی منافع حاصل کئے اور اپنی تجارت کو توسیع دی۔ یہی وجہ تھی کہ تیسری صلیبی جنگ نے ''ارض مقدس'' کی بازیابی سے زیادہ اطالوی شہروں کے لئے تجارتی منافع کے حصول کو اپنا مقصد قرار دیا۔ صلیبی جنگوں کے عیسائی کرتا دھرتا یروشلم کے حصول کے لئے بے قرار نہیں تھے جتنا کہ وہ ایشیائے کوچک کے تجارتی شہروں کو اپنے قبضہ میں لانے کے لئے بے تاب تھے کیونکہ ان شہروں سے ان کے تجارتی مفادات وابستہ تھے۔ خاص کر چوتھی صلیبی جنگ (1201) کے نتیجے میں وینس نے تجارت کے

میدان میں بہت ہی اہم اور نفع بخش حیثیت اختیار کر لی۔ وینس کی تجارتی اہمیت کا اندازہ اس فرانسیسی قاصد کی درخواست سے ہوتا ہے جو اس زمانے میں فرانس کے کلیسا کی طرف سے وینس کے حکام کے پاس چوتھی صلیبی جنگ کے لئے مراعات کی درخواست لے کر حاضر ہوا۔ اس فرانسیسی کلیسا کے نمائندہ پادری کا نام وی ہاروں (Villehardouin) تھا۔ یہ ان چھ قاصدوں میں سے ایک تھا جو وینس کے صدر مجسٹریٹ کے پاس فرانسیسی کلیسا کے قاصدوں کے درمیان جو مکالمہ ہوا وہ وی ہاروں کی یاداشت میں محفوظ ہے:

''جناب والا میں فرانس کے امرا کی طرف سے آیا ہوں جنہوں نے صلیب کی حمایت کی قسم کھائی ہے، اس لئے میں درخواست کرتا ہوں کہ خدا کے لئے ان مجاہدوں کے لئے سواریوں اور جہازوں کا انتظام فرما دیجئے۔،

'کن شرائط پر؟'

'ہر چیز پر جو آپ تجویز کریں اور وہ لوگ اسے پورا کر سکیں۔'

'ہم آپ کو جہاز مہیا کر سکتے ہیں، ایسے جہاز جن میں ایک دروازہ ہوگا اور اس کے عقب میں گھوڑوں کے سوار کرنے کی گنجائش بھی ہوگی۔ اس جہاز میں چار ہزار پانچ سو گھوڑے اور نو ہزار ایسکوائرز ہونگے اور ایک دوسرا بڑا جہاز ہوگا جس میں چار ہزار پانچ سو نائٹس اور بیس ہزار پیدل فوج ہوگی۔ شرط یہ ہوگی کہ نو مہینے تک ان تمام آدمیوں اور گھوڑے کی غذا کے انتظام کی ذمہ داری لی جائے۔ کم سے کم معاوضہ جو ہم قبول کر سکتے ہیں وہ ہر گھوڑے کے لئے 4 مارکس اور ہر آدمی کے لئے 2 مارکس ہیں۔ ہم خدا کی محبت میں اس کے علاوہ کچھ اور بھی کر سکتے ہیں۔ ہم پچاس مسلح بادبانی جہاز اور دیں گے۔ شرط یہ ہوگی کہ جب تک ہمارے درمیان معاہدہ باقی رہے ہر خطہ زمین کی فتح میں یا دولت کے حصول میں خواہ وہ زمین ہو یا سمندر ہمارا نصف حصہ ہوگا۔،

'جناب والا ہمیں آپ کی تمام شرطیں منظور ہیں۔''

اس مکالمے سے بعض اہم باتیں اس دور کے متعلق واضح ہو جاتی ہیں۔ اولاً کہ وینس کا تاجر طبقہ ان صلیبی جنگوں کے دوران کس قدر مضبوط اور توانا ہو گیا تھا اور اب یہ تجارت کے ساتھ جہاز سازی کی صنعت میں بھی قدم رکھ رہا تھا۔ دوئم اس تاجر طبقے کے اثر کا یہ عالم تھا کہ حکام بھی ان کے تجارتی مفادات کو پیش نظر رکھتے تھے۔

اوپر لکھے ہوئے مکالمے سے دوسری یہ بات خاص طور پر واضح ہوتی ہے کہ وینس کے تاجر

''خدا کی محبت'' میں صلیبی جنگوں میں حصہ لینے والوں کی مدد کرنے کے لئے تیار تھے لیکن ان کی آنکھیں مال غنیمت کے انبار کی طرف سے بھی قطعاً غافل نہ تھیں۔ وہ پکے تاجر تھے۔ گو مذہبی نقطہ نظر سے یہ جنگیں کچھ زیادہ دیرپا اور سودمند نتائج مہیا نہ کر سکیں، کیونکہ مسلمانوں نے بعد میں یروشلم پر دوبارہ قبضہ کر لیا، لیکن تجارتی نقطہ نظر سے ان جنگوں نے مغربی یورپ کے لئے ایک حد تک فیصلہ کن رول ادا کیا۔ ان جنگوں نے مغربی یورپ کے جاگیرداری نظام کو ایک طرح سے ہلا کر رکھ دیا۔ کلیسا کے پادریوں، جنگجو سپاہیوں، کام کرنے والے دست کاروں اور تاجروں کی بڑھتی ہوئی بااثر جماعتیں تمام براعظم پر چھا گئیں۔ انہوں نے بیرونی مال کی طلب بڑھا دی، انہوں نے بحیرہ روم کا راستہ مسلمانوں سے چھین لیا اور انہوں نے ایک مرتبہ پھر اس زبردست تجارتی راستے کو کھول دیا جو قدیم زمانے سے مشرق اور مغرب کے تجارتی خطوں کو ملاتا تھا۔

1- یہ سمجھنا کہ سرکاری اہل کار طبقاتی مفادات سے بالا ہوتے ہیں بالکل غلط ہے۔ نہ یہ ازمنہ وسطیٰ میں اہل کار غیر جانبدار امر اور طبقاتی مفادات سے بالا تھے اور نہ ہی آج ہیں۔ اس لئے جب ایک سپر پاور کا سربراہ (یعنی صدر بش) جاپان جا کر وہاں 20 ہزار کاروں کی فروخت کا معاملہ طے کرتا ہے تو یہ کیا ہے؟ یا جب ملکوں کے حاکم اور سربراہ دوسرے ملکوں کے دورے پر جاتے ہیں تو اپنے ساتھ وزیر خزانہ اور وزیر اقتصادیات و تجارت کو کیوں لے جاتے ہیں؟ وجہ ظاہر ہے، یعنی اپنے اپنے ممالک کے تجارتی اور حقیقی مفادات کو مقدم رکھا جائے۔ نہ پرانے زمانے کی سیاست کو، نہ آج کی سیاست کو اقتصادیات کے حوالے کے بغیر صحیح طور پر نہیں سمجھا جا سکتا، گو یہ اقتصادی مفادات کبھی قوم پرستی کے لبادے کے پیچھے چھپے رہتے ہیں، کبھی مذہب اور روحانیت کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ ع۔م

آج کل تجارت ہر وقت اور ہر جگہ ہمارے چاروں طرف ہوتی رہتی ہے۔ اب ہم نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ دنیا کے دور دراز گوشوں سے ہم چیزیں منگوا سکتے ہیں اور وہاں بھیج سکتے ہیں۔ بارھویں تیرھویں صدی کے دور میں نقل و حمل کے ذرائع ابھی اتنی ترقی نہیں کر پائے تھے اور یورپ کے آج کے جو شہر ایک عالم میں شہرت رکھتے ہیں وہ معمولی گاؤں تھے جہاں پر خرید و فروخت اور تجارت کا کوئی اہتمام نہیں تھا۔ تجارت کے مستقل نظام کی طرف پہلا قدم وہ تجارتی میلے تھے جو انگلستان، فرانس، بلجیم، جرمنی اور اٹلی میں مقررہ وقتوں پر لگتے تھے۔ یہی ملک آہستہ آہستہ یورپ کے تجارتی مراکز بنے۔ پہلے معمولی ضروریات کی تکمیل کے لئے دیہات سے

اشیاء تبادلے کے لئے آتیں اور ہر ہفتے مختلف مقامات پر اجتماع لگتے۔ لیکن صلیبی جنگوں کے بعد جب عام لوگوں کو باہر کی دنیا کا علم ہوا اور ضرورتیں اور طلب میں اضافہ ہوا تو یہ مقامی ہفتہ وار بازار ناکافی محسوس ہونے لگے۔ چنانچہ فرانس کے شہر پوائے (Poix) میں پہلی بار وہاں کے باشندوں نے باقاعدگی کے ساتھ سال میں دو بار تجارتی میلے لگانے کا اہتمام کرنے کی درخواست کی۔ یہ درخواست جو آج بھی فرانس کے نوادراتی لائبریری میں محفوظ ہے، پوائے اور کناپلے (Canaples) کے رؤسا کی طرف سے شہنشاہ فرانس کو بھیجی گئی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا:

''ہم کو پوائے اور کناپلے کے مواضعات کے رئیس ژاں دی کریک کی (Jehan de Cwequy) کی درخواست ملی ہے، ہم کو اس درخواست سے معلوم ہوا کہ پوائے اور اس کے مواضعات ایک زرخیز اور سرسبز علاقے میں واقع ہیں اور وہاں عام لوگ اور تاجر وقتاً فوقتاً آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہاں ہر ہفتہ ایک بازار اور سال میں دو میلے ہوا کریں اس لئے ہم ان کی درخواست کے مطابق ہر سال دو میلے اور ہفتہ وار مقامی بازار قائم کرنے کی اجازت دیتے ہیں''

وہ علاقہ جہاں ان میلوں کی اجازت ملی وہ شمپین (Champagne) کہلاتا ہے تھا۔ معلوم نہیں علاقہ سے اس نام کی شراب کو شہرت حاصل ہوئی یا شراب کی وجہ سے اس علاقے کا نام شمپین پڑا، بہرحال اس علاقے میں ہونے والے تجارتی میلے سے متعلق فرانس کے شہنشاہ کا ایک اعلان بہت ہی اہم مانا جاتا ہے یہ اعلان 1349 عیسوی میں کیا گیا:

''تاجروں کی تمام جماعتیں اور تمام تاجر افراد خواہ وہ اطالوی ہوں یا فلورنس کے رہنے والے ہوں یا جرمن نژاد ہوں، بہرحال وہ تمام تاجر جو دوسرے ملکوں سے آتے ہوں اور ہماری سلطنت کے رہنے والے نہ ہوں، ان سب کو معلوم ہو کہ اگر وہ ہمارے یہاں تجارت کرنا اور میلہ مذکور کے تمام مراعات اور منافع بخش کاربار سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو وہ پورے اطمینان سے آسکتے ہیں۔ انہیں ٹھہرنے اور ان کی واپسی کے لئے سہولتیں دی جائیں گی اور ان کا سامان تجارت اور ان کی رہائش وغیرہ سب محفوظ رہیں گے ہم ان کی حفاظت اور ان کے سامان کی نگرانی کا ذمہ لیتے ہیں۔

MashalBooks.com

میلے کے نگران کارکنوں کے سوا کسی کو اختیار نہ ہوگا کہ ان کو روکے، گرفتار کرے یا باز پرس کرے۔''

اس زمانے میں اس قسم کے اعلانات زبردست اہمیت کے حامل تھے کیونکہ ازمنہ وسطی کا یہ وہ زمانہ تھا جب ابھی امن عامہ کا کوئی تصور وجود میں نہیں آیا تھا اور زاہزانی اور ڈکتیاں روزمرہ کا معمول تھا۔ لیکن بڑھتی ہوئی تجارت نے پہلی بار ایک طرف امن اور تحفظ کی ضرورت کو جنم دیا تو دوسری طرف ایک قسم کی مرکزیت کی ضرورت کا احساس دلایا۔ تاجر طبقہ کے لئے کہ مرکزیت بڑی اہم تھی کیونکہ ان میلوں میں شریک ہونے والے تجاروں کو جگہ جگہ پر مختلف جاگیرداروں کو محصولات اور چنگی کی رقوم ادا کرنی پڑتی تھیں۔ یہ تاجر طبقہ کی ضرورت تھی جس نے چھوٹی چھوٹی جاگیرداریوں کو ختم کر کے سماجی نظام کو اس دور کی اہم ضرورت بنا دیا۔

تصویر آنی ہے

MashalBooks.com

شہر نمودار ہوتے ہیں

بارھویں صدی یو رپ میں جیسے جیسے تجارت بڑھی ویسے ویسے ہر طرح کے کاروبار، زراعت اور صنعتی شعبوں میں ترقی ہونے لگی۔ ان ساری سرگرمیوں کے نتیجے پر بڑی تعداد میں شہر نمودار ہونے لگے۔

یہ بات نہیں کہ ایک نوعیت کے شہر پہلے نہیں ہوا کرتے تھے، مگر یہ زیادہ تر فوجی اور عدالتی مراکز تھے جہاں بادشاہوں کے دربار منعقد ہوتے تھے۔ ان شہروں کی حیثیت دیہی قصبوں سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن تجارت پھیلنے کے نتیجے پر جو نئے شہر ابھرے ان کی کچھ اور ہی خصوصیات تھیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ کہ نئے شہر ان علاقوں میں ابھرے جہاں تجارتی سرگرمیاں خاص طور پر شدت اختیار کر رہی تھیں۔ یہ علاقے تھے نیدر لینڈز اور اٹلی۔ ان ملکوں میں بھی نئے شہر زیادہ تر وہاں آباد ہوئے جہاں یا تو مختلف سمتوں سے آنے والی سڑکیں ملتی تھیں، یا جہاں دریاؤں کے دہانے تھے اور تجارتی کشتیوں اور

MashalBooks.com

جہازوں کی آمدورفت کی سہولت تھی۔ان جگہوں پر عام طور پر ایک کیتھی ڈرل ہوتی تھی یا ایک ایسی جگہ ہوتی تھی جس کے گرد دیوار کھنچی ہوتی تھی جو گڑبڑ کے وقت شہریوں کی حفاظت کرتی تھی ۔جب ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہوئے سوداگروں کی تعداد زیادہ ہونے لگی تو انہوں نے پرانے شہروں سے باہر چاردیواریاں بنانا شروع کردیں اور یوں نئے شہروں کی بنیادیں پڑیں۔

پرانا جاگیرداری نظام جس انداز میں چلتا تھا اگر اس کو خیال میں رکھا جائے تو ہم فوراً یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ نئے سوداگروں کی سرگرمیاں جلد ہی پرانے نظام سے متصادم ہوں گی۔جاگیرداری نظام کا ڈھانچہ رسم ورواج کی بندشوں میں مقید تھا اور اس میں کسی قسم کی آزادی کی گنجائش نہ تھی ۔شہروں میں کاروباری زندگی جو تیز رفتاری سے بڑھ رہی تھی اس کے لئے جاگیرداروں کی بندشیں ناقابل برداشت تھیں کیونکہ وہ تجارت میں زبردست رکاوٹ ثابت ہو رہی تھیں ۔تاجروں کو جس آزادی کی خواہش اور ضرورت تھی وہ جاگیرداری نظام مہیا نہیں کرسکتا تھا۔وجہ یہ تھی کہ شہروں کی تمام اراضی جاگیردار، امرا، بشپ، کلیسا اور بادشاہوں کی ملکیت ہوتی تھیں اور یہ جاگیردار اپنی شہری ملکیت کو بھی اسی نگاہ سے دیکھتے تھے۔جس نگاہ سے وہ اپنی عام زیرکاشت اراضی کو دیکھتے تھے ان کو شہروں میں بھی محصولوں کی وصولی کی توقع ہوتی تھی اور وہ شہروں میں بھی ٹیکس لگانا اور مزدوروں سے جسمانی محنت کروانا اپنا پیدائشی حق تصور کرتے تھے۔عدل وانصاف کے لئے وہ اپنی طرز کی مخصوص عدالتیں شہروں میں بھی قائم کرنا چاہتے تھے ۔لیکن شہروں کے تاجر آبادی کی ضرورتیں اب بالکل مختلف تھیں۔ان کے لئے پرانے رسم ورواج کا ٹیکس اور ٹیکس کی قاعدے قوانین رکاوٹیں تھیں جو اشیاء کی آمدورفت کو تجارت کے فروغ کو روکتی تھیں۔

اس صورت حال نے تاجروں کو نئی نہج پر سوچنے کے لئے مجبور کیا۔تاجر بنیادی طور پر ایک حوصلہ مند جماعت ہوتی ہے اور وہ اپنی تجارت کی وسعت کے لئے نئی راہوں اور نئے طریقوں کی تلاش میں رہتی ہے۔اس کام کے لئے انہیں آزادی کی ضرورت ہوتی ہے۔یہ آزادی انہیں کیسے مل سکتی تھی؟ان کے تجربے نے انہیں بتایا کہ اگر وہ متحد ہو جائیں تو پرانے نظام سے لڑ سکتے ہیں۔چنانچہ انہوں نے اپنی جماعتیں بنا لیں جنہیں اس زمانے میں ''گلڈز'' یا ''ہنسیز'' کہا جاتا تھا۔ان جماعتوں کے ذریعہ انہوں نے جاگیرداروں اور نوابوں کو مجبور کیا کہ وہ

انہیں وہ آزادیاں دیں جو ان کی کاروباری سرگرمیاں کے لئے ضروری تھیں ۔تاجر طبقے کی ضرورتوں اور ان کی تجارت کی وسعت کے تقاضوں نے جس فکر اور فلسفے کو جنم دیا اس نے اس وقت کے کئی ایک روشن خیال جاگیرداروں اور بادشاہوں کو بھی ایک حد تک متاثر کیا کیونکہ یہ جاگیردار اور بادشاہ محسوس کرتے تھے کہ زمانہ اور زمانے کی ضرورتیں بدل رہی ہیں ۔ چنانچہ شاہ لوئی ہفتم نے شہر لوری (Lorris) کے لئے 1155 میں ایک منشور نافذ کیا جس میں یہ پیراگراف شامل تھا:

''جو شخص ایک سال سے ایک دن زیادہ لوری کے کلیسا حلقے میں قیام کرے گا اور عرصہ میں اس کے خلاف کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی ہوگی اور اس نے کبھی ہمارے یا ہمارے نائب کے سامنے آنے اور عرضداشت پیش کرنے سے گریز نہیں کیا ہوگا، وہ آزادی سے یہاں رہ سکتا ہے اور اس کی جان و مال کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔''

لیکن یورپ کے یہ نئے شہری صرف ذاتی آزادیاں ہی نہیں چاہتے تھے۔ وہ زمین کی خرید وفروخت کی آزادی چاہتے تھے۔ جاگیرداری نظام کا یہ رواج کہ کوئی شخص زمین کو دوسرے سے صرف عارضی طور پر ملکیت میں لے سکتا ہے سوداگروں کو پسند نہیں تھا، کیونکہ اگر انہیں تجارت کے لئے نقد کی فوری ضرورت ہوتی تو وہ اس بات کا حق نہیں رکھتے تھے کہ زمین کو بیچ کر یا رہن رکھ کر نقد حاصل کر سکیں ۔ چنانچہ لوری کے چارٹر میں ،جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے ،شہریوں کو اس معاملے پر خاص طور پر یقین دہانی کی گئی تھی: ''اگر کوئی شہری اپنی جائداد فروخت کرنا چاہے تو اس کو ایسا کرنے کا اختیار ہوگا۔'' زمین کی ملکیت کا وہ نظام جس کا ہم نے پچھلے باب میں ذکر کیا ہے اگر آپ اس نئی پالیسی سے موازنہ کریں تو فوراً احساس ہوگا کہ تجارت اور شہروں کے باعث سماج میں کتنی زبردست تبدیلی آئی ہوگی۔

صرف یہی نہیں ،شہری عدالتیں بھی اپنی الگ بنانا چاہتے تھے ۔ جاگیرداری نظام میں عدالتیں ایک ایسے معاشرے کے لئے تھیں جو کہ ساکن تھا، جہاں ایک ہی قسم کے مسائل پیدا ہوتے تھے اور جن کے تصفیوں میں وقت لگتا تھا۔ انصاف کا یہ نظام ایک سرگرم تجارتی شہر کی کمیونٹی کے لئے موزوں نہیں تھا۔ نہ صرف ان کے مسائل کی نوعیت قطعی مختلف تھی بلکہ یہ بھی ضروری تھا کہ امن کا فیصلہ جلد کیا جائے تاکہ کاروبار میں رکاوٹ نہ پڑے۔

اسی طرح شہری لوگ اپنی مرضی کا ٹیکس کا نظام چاہتے تھے۔ ان کے لئے جاگیرداروں کے

لگائے ہوئے طرح طرح کے بیسیوں ٹیکس، ادائیگیاں، جرمانے وغیرہ جھنجٹ کا باعث تھے۔ یہ لوگ تجارت پر سے محصول وغیرہ قسم کی ساری پابندیاں اٹھانا چاہتے تھے جن سے تجارت کے بہاؤ میں رکاوٹیں پڑتی تھیں۔ ان پابندیوں کو ختم کرنے میں انہیں پوری کامیابی تو نہیں ہوئی لیکن ان کو بہت حد تک تبدیل کر دیا گیا۔ اس طرح رفتہ رفتہ شہران سوداگر شہریوں کے کنٹرول میں آ گئے اور جاگیرداری ملکیت اور انتظامیہ سے آزاد ہو گئے۔ اس کی ایک مثال جرمنی کا شہر ڈورٹمنڈ (Dortmund) تھا۔ 1241 میں ڈورٹمنڈ کے کاؤنٹ نے اپنے کچھ اختیارات شہریوں کو فروخت کرنے کیلئے مندرجہ ذیل اعلان کیا:

''میں ڈورٹمنڈ کا کاؤنٹ کونریڈ (Conrad) میری بیوی گیسل ٹروڈ (Giseltrude) اور میرے تمام وارث سب اپنا گھر جو بازار کے قریب واقع ہے ڈورٹمنڈ کے شہریوں کے ہاتھ فروخت کر رہے ہیں اور ان کی طرف تمام دائمی حقوق منتقل کرتے ہیں۔ ہم ان کو وہ حقوق بھی دے رہے ہیں جو ہم کو مقدس رومن امپائر کی طرف مذبح قائم کرنے کیلئے جوتے بنانے کے کارخانے لگانے کیلئے اور اس تندور کو لگانے کیلئے ملے تھے جو دار العدالت کے اوپر واقع ہے۔ ان تمام عمارتوں اور کارخانوں کے عوض میں ہم 4 دناری عوض میں ایک پاؤنڈ کالی مرچ سالانہ لیں گے۔''

اس دور میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں ان سے مراعات یافتہ طبقوں میں سے کچھ لوگ خواہ وہ جاگیردار ہوں یا کلیسا سے تعلق رکھنے والے، یقیناً باخبر تھے، اور ان میں سے کچھ نے ان تبدیلیوں کو قبول کر لیا اور ان سے فائدہ اٹھایا۔ لیکن ایسے بھی لوگ تھے جو ان حالات کو قبول کرنے سے انکاری تھے اور بہ رضا و رغبت ان نئی قوتوں کے آگے ہتھیار ڈالنے کے لئے آمادہ نہ تھے، بلکہ وہ ان نئی قوتوں سے نبرد آزما ہونے اور ان کو شکست دینے کے لئے اپنے کو تیار کر رہے تھے۔ تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہوتا آیا ہے کہ دولتمند اور مراعات رکھنے والے طبقات اپنی طاقت برقرار رکھنے کیلئے ہر حربہ استعمال کرتے ہیں اور صرف یہی بات نہیں کہ تبدیلیوں سے ان لوگوں کو اپنے ذاتی مفادات خطرے میں پڑے نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ان لوگوں کو اپنے ذاتی مفادات خطرے میں پڑے نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے اکثر ایسے بھی تھے جو ایمانداری سے اس نتیجے پر پہنچے تھے اگر پرانا نظام بدستور نہیں رہا تو سماج کا سارا تانا بانا بکھر جائے گا۔ چنانچہ پرانی اور

نئی قوتوں کے درمیان تصادم ناگزیر تھا، اور کئی شہروں کو خون خرابے کے بعد ہی اپنی آزادیاں نصیب ہوئیں۔

مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کے شہروں کے یہ منظّم تاجر طبقے تبدیلیوں اور اپنے حقوق کی یافت کے خواہشمند ضرور تھے لیکن آج کی طرح کے وہ انقلابی نہ تھے۔ وہ جو دباؤ ڈال رہے تھے اس کا مقصد جاگیرداری نظام کو جڑ سے اتار پھینکنا نہ تھا بلکہ ان کا مقصد اور غرض صرف اتنی تھی کی وہ ان قدیم جاگیردارانہ رسموں، روجوں اور پابندیوں سے چھٹکارا حاصل کر کے کچھ آسانیاں پیدا کرلیں، تاکہ ان کی بڑھتی ہوئی تجارت کی راہ کی رکاوٹیں دور ہو جائیں۔ ابھی ان کے لئے نہ وقت آیا تھا اور نہ ان میں اتنی منظّم قوت تھی کہ وہ انقلاب فرانس یا انقلاب امریکہ کی طرح انسانی آزادی، مساوات اور برابری کے نعرے لگائیں۔

بارہویں اور تیرھویں صدی کے یورپ میں تاجروں کی کیفیت کے بارے میں ایک مورخ نے تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اس دور کے تاجروں نے ذاتی آزادی کا فطری حق کے طور پر کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ وہ ذاتی آزادی چاہتے تھے لیکن محض ان سہولتوں کے لئے جو خود بخود اس کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں۔ یہ واقعہ نظر انداز کرنے کے لائق نہیں کہ انہوں نے آرا (Arras) میں سینٹ واسٹ (St.Vast) کی خانقاہ میں اپنے کو خانقاہ کے سرفوں میں شمار کرایا وہاں کے بازار میں چنگی کے محصول انقلاب سے، جس سے وہاں کے سرف مستثنیٰ تھے، بچ جائیں۔''

محصول انقلاب فرانس ہو یا انگلستان کا صنعتی انقلاب یا امریکہ کی جنگ آزادی ان سب تک پہنچنے کے لئے تاجروں کو مختلف اور گنجلک حالات سے گذرنا پڑا۔ بہت سے حقوق جاگیرداروں اور فرمانرواؤں نے اپنے خزانوں میں کمی ہوتے دیکھ کر، یا تاجروں کی تجارت میں حصہ لینے کے لئے مجبوراً یا کسی حد تک رضا و رغبت سے دے دیئے۔ دراصل اس پورے دور میں تاجر طبقہ جاگیرداری نظام کے اندر ہی پھلتا پھولتا رہا۔ بہر حال اس زمانے میں تجارت حصول دولت کے ایک کی حیثیت سے اہمیت حاصل کر رہی تھی۔ تاجروں نے شہروں میں جو غیر معمولی اثر و اقتدار حاصل کیا تھا اس سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب زرعی اراضی کی جگہ دولت روپیہ پیسہ کی شکل میں ابھرنے لگی تھی۔ یہ ایک زبردست تبدیلی تھا۔ جاگیرداری نظام

کی ابتدا میں روپیہ ایک مردہ، غیر متحرک اور جامد وجود رکھتا تھا۔ لیکن اب وہ زندہ متحرک اور رواں تھا پہلے تمام اقتدار جاگیردار کے ہاتھ میں تھا، پھر آہستہ آہستہ کلیسا اس اقتدار میں نہ صرف شریک ہو گیا بلکہ وہ با اقتدار طبقہ کا بالادست عنصر بن گیا۔ لیکن اب تاجر طبقہ کے وجود میں آنے سے اقتدار کی اس دوئی میں ایک تیسرا عنصر داخل ہونے لگا تھا۔

یہ نیا طبقہ پہلی دونوں قوتوں سے مختلف تھا۔ پہلی دونوں قوتیں دراصل ایک تھیں، کیونکہ ان دونوں کی قوت اور دولت کا منبع زرعی اراضی تھی۔ نئے طبقے کی زندگی کا انداز ان دونوں سے الگ تھا۔ یہ خریدنے اور فروخت کرنے والا طبقہ تھا۔ اور اب زرعی اراضی کا نہیں بلکہ سکہ اور روپے کے راج کا زمانہ شروع ہو رہا تھا۔

نئے خیالات کی آمد آمد

نئے افکار کی کونپلیں کیسے پھوٹتی ہیں؟ دراصل یہ ضرورتوں کی مٹی میں جنم لیتی ہیں۔ جب یورپ میں تاجر پیشہ طبقہ پیدا ہوا تو وہ اپنے ساتھ نئی ضرورتیں اور ان کے نتائج کے بارے میں پچھلے صفحات میں ذکر کر آیا ہوں لیکن ان نئی ضرورتوں میں کچھ اور بھی تھیں جن پر غور کرنا ضروری ہے۔ مثلاً اگر ہم آج کے زمانے میں اور اپنے اردگرد پر نگاہ ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آج کی تجارت اور قرض کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کوئی بڑا تاجر ہو یا چھوٹا دکاندار اسے اپنی دکان میں مال ڈالنے کے لئے بنکوں اور ساہوکاروں سے قرض لینا پڑتا ہے، اور اس کے عوض وہ قرضہ دینے والے کو سود دیتا ہے۔ بڑے سے بڑے کاروبار، حتیٰ کہ ملٹی نیشنلز بھی بنکوں سے قرض لینے اور سود دینے کے نظام کے اندر کام کرتے ہیں لیکن یورپ میں جاگیرداری کے عروج کے زمانے میں جاگیردار اور اس دور کے مذاہب سود کو حرام اور گناہ سمجھتے تھے، اور اس کے خلاف ان کی جانب سے زبردست مزاحمت کی گئی۔ مثال کے طور پر سود خوری کے خلاف انگلستان میں ایک قانون پاس ہوا جس کے الفاظ یہ تھے:

''سود خوری خدا کے حکم سے بالکل حرام قرار دی گئی ہے۔ خدا کے احکام اور مذہبی

تعلیمات ایسے شخص کے دل میں، جو دولت کی ہوس سے خراب ہو چکا ہو، جڑ نہیں پکڑ سکتے۔ ایسے شخص کے دل میں نیکی قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ اس لئے سلطنت کے لئے قانون بنایا جاتا ہے کہ اس ریاست کا کوئی شخص یا اشخاص خواہ وہ کسی مرتبہ کے ہوں، ان کا کوئی منصب ہو اور وہ کسی صفت اور حالات کے مالک ہوں، وہ کسی شعبے سے، کسی ذریعہ، کسی قاعدے سے کوئی رقم یا رقمیں کسی قسم کے سود پر نہیں دے سکتے اور نہ سود لے سکتے ہیں اور نہ سود لینے کی امید بھی کر سکتے ہیں۔ اس رقم پر جو انہوں نے قرض دی ہے وہ کوئی اضافہ نہیں لے سکتے اگر وہ اس حکم کی خلاف ورزی کریں گے تو ان کی رقم یا رقمیں اور ان کا سود سب ضبط کر لیا جائے گا۔''

اس حکم اور قانون سے ہمیں واضح طور پر اس امر کا اندزہ ہو جاتا ہے کہ قرون وسطیٰ میں عوام کی بڑی تعداد کا خیال سود خور کے متعلق کیا تھا۔ لیکن سوال جس پر غور ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس دور میں لوگ سود کے مخالف کیوں تھے؟ اس سوال کے جواب کے لئے ہمیں جاگیرداری نظام کے تانے بانے پر اچھی طرح نگاہ ڈالنی چاہئے۔ جاگیرداری زمانے میں تجارت بہت چھوٹے پیمانے پر ہوتی تھی۔ اس زمانے میں نفع کی نیت سے کہیں روپیہ لگانا نہ تو ممکن ہی تھا اور نہ ہی اس امر کی کوئی ضرورت ہی درپیش تھی۔ اگر کوئی شخص قرض چاہتا بھی تو اسے یہ کبھی خیال نہ ہوتا کہ وہ اپنی دولت میں اضافے کے لئے قرض لے رہا ہے، اس کو صرف زندگی کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے قرض کی حاجت ہوتی تھی۔ دوسرے الفاظ میں قرض کی ضرورت زیادہ تر نادار لوگوں کو ہی پڑتی تھی۔ ان کے مویشی مر جاتے یا کثرت باراں سے فصل تباہ ہو جاتی تو وہ قرض کے طالب ہوتے۔ قرون وسطی کے مروجہ اخلاق کا یہ تقاضا ہوتا تھا اگر کوئی انسان یا ہمسایہ مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو اس کی مدد انسانی فرض ہے اور اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اپنے نفع کی فکر نہ کرنی چاہیے۔ نیک عیسائی نفع کا خیال کئے بغیر اپنے پڑوسی کی مدد کرتا تھا۔

اس دور میں کلیسا کا خیال تھا کہ انسان کی عملی زندگی کے نیک اور بد دو پہلو ہوتے ہیں۔ انسان کے مذہبی اعمال بھی اچھے برے پہلوؤں کی تعین کے لئے اپنے علیحدہ اصول نہیں بنائے تھے، بلکہ سماجی زندگی کی اچھائی برائی کے معیار اور معاشی زندگی کے اچھے اور برے پہلو جانچنے کے جو پیمانے عام طور سے تسلیم کئے جاتے تھے کلیسا نے بھی انہی کو اپنا لیا تھا۔ اس طریقہ کار کا اگر آپ آج زندگی سے مقابلہ کریں تو بڑا فرق نظر آئے گا۔ تاجر کسی اجنبی کے ساتھ تجارتی

معاملات میں کچھ ایسی باتیں کرسکتا ہے جو وہ اپنے دوستوں اور ہمسایوں کے ساتھ روا نہیں رکھ سکتا۔ دوسرے الفاظ میں، اب ہم نے تجارت اور زندگی کے دوسرے معاملات کے لئے علیحدہ دو معیار بنا رکھے ہیں۔ ایک کارخانہ دار اپنے حریف کارخانہ دار کو میدان سے ہٹانے کے لئے کچھ بھی کرسکتا ہے۔ وہ چیزیں کم قیمت پر فروخت کرے گا اور ہر قسم کے ایسے داؤ استعمال کرنے سے گریز نہیں کرے گا جن سے وہ اپنے مدمقابل صنعت کار یا تاجر کو میدان سے ہٹنے پر مجبور کر سکے۔ اب تاجر کا ایک تجارتی اخلاق وضع ہو گیا ہے جس کا بنیادی اصول ہی یہ بن گیا ہے کہ ''کاروبار کاروبار ہے'' جس کے دائرے میں وہ اپنی جارحانہ حرکات کو بالکل جائز سمجھا ہے۔ اس کو اپنے مدمقابل صنعت کاری کی تباہی سے قطعاً رنج نہیں ہوگا حالانکہ یہی شخص اپنے پڑوسی یا دوست کی ایک وقت کے فاقے کی مصیبت بھی نہ دیکھ سکے گا۔ اس طرح سے تاجر اور صنعت پیشہ لوگوں نے اپنی کاروباری زندگی کے لئے کچھ اور اصول بنا لئے ہیں اور غیر کاروباری زندگی کے لئے کچھ اور۔ یہ اصول جو آپس میں ایک دوسرے سے متضاد ہوں درست نہیں تھے۔ اور اس زمانے میں چرچ جو سوچتی تھی سماج کی اکثریت بھی وہی سوچتی تھی۔

قرون وسطیٰ میں دولت کے انبار جمع کرنا اخلاقی نقطہ نظر سے درست نہیں سمجھا جاتا تھا۔ صرف اتنا روپیہ جو زندگی کی ضروریات کی کفالت کر سکے کافی سمجھا جاتا تھا چنانچہ بائبل میں اس بارے میں کھلے ہوئے احکام موجود ہیں: ''یہ ممکن ہے کہ ایک اونٹ سوئی کے ناکے سے گذر جائے لیکن یہ ہرگز ممکن نہیں کہ ایک دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو سکے۔''

قرون وسطیٰ کے اہل کلیسا کا ایک اور تجزیہ نگار لکھتا ہے:

''جس شخص کے پاس اپنی ضروریات کی کفالت کے لئے روپیہ موجود ہو لیکن وہ پھر بھی دولت کی مسلسل طلب میں ہاتھ پیر مارتا ہو صرف اس لئے کہ اپنی دولت کے زور سے سماج میں زیادہ اونچا درجہ حاصل کرے، یا آئندہ بغیر ہاتھ پیر ہلائے زندگی کی ضرورتیں آسانی سے پوری کرتا رہے، یا اتنی دولت چھوڑ جائے کہ اس کے لڑکے ایک صاحب دولت اور صاحب عزت آدمی کی حیثیت سے رہ سکیں، وہ قابل نفرت حد تک حریص ہے، نفس پرستی اور غرور کا بندہ ہے''

چنانچہ یہ دور تھا جب ایک طرف نئی ضرورتیں نئے افکار کو جنم دے رہی تھیں تو دوسری طرف پرانی ڈگر پر چلنے والے لوگ انہی پرانے اصولوں اور افکار و اخلاق پر مصر تھے۔ لیکن یہ نظریہ کہ سود

لینا گناہ ہے ان تاجروں کے لئے جو نئے انداز پر تجارت کی داغ بیل ڈال رہے تھے، بڑی تکلیف کا موجب تھا۔ یہ نئے تاجر پورے یورپ میں اپنی تجارت کو پھیلانا چاہتے تھے، اور اس کے لئے ان کو روپے کی ضرورت تھی۔ یہ تاجر روپیہ حاصل کرنے کے لئے کس کے پاس جاتے؟ اس میں سرمائے کے دو ذرائع تھے۔ ایک تو یہودی ساہوکار تھے (ایسے ہی ایک ساہوکار کا نقشہ شیکسپیئر نے اپنے شہرہ آفاق ڈرامے مرچنٹ آف وینس میں شائلوک کے کردار میں پیش کیا ہے۔ اور ہماری فلموں اور ادب میں اب تک ہندو بنیوں کو اسی رنگ میں پیش کیا جاتا ہے ع۔م) دوسرے بڑے بڑے سوداگر تھے جنہوں نے اب اشیا کی تجارت چھوڑ کر روپیہ پیسہ کا لین دین شروع کر دیا تھا، یعنی وہ اس زمانے کے عظیم بنکر بن گئے تھے۔ لیکن یہ کام آسان نہیں تھا کیونکہ بیچ میں چرچ کھڑی تھی جو سود کو گناہ قرار دیتی تھی۔

1۔ اسی قسم کے افکار ہم کو اسلام کے ابتدائی دور کے صحابہ کرام، مثال کے طور پر ابوذر غفاری، کے افکار میں بھی ملتے ہیں، سوا ابتدائی جاگیرداری نظام ہو یا عربوں کا قبائلی نظام یا سامی نسل کے دوسرے مذاہب ہوں ان سب کے ابتدائی دور میں اس قسم کے افکار ہمیں عام ملتے ہیں۔ ان سب مذاہب میں اخلاق کے ابتدائی رویوں میں خاصی یکسانیت ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور کی معاشیات قدرتی پیداوار پر مبنی تھی۔ لیکن جب سماج کی معاشی بنیاد بدلنے لگی اور روپیہ پیسہ کا لین دین ہونے لگا تب بھی بہت سے لوگ ایسے تھے جو پرانے اصولوں اور خیالات سے بندھے رہے۔ یہاں تک کہ جب معاشی تبدیلیوں نے ایک سیلاب کی صورت اختیار کر لی تب بھی وہ اسی بات پر مصر تھے کہ اگر کسی شخص کو سو پاؤنڈ قرض دیا جائے تو قرض دینے والے کو صرف سو پاؤنڈ ہی واپس لینے کا اخلاقی حق تھا۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اگر کوئی سو پاؤنڈ سے زیادہ رقم منافع یا سود کے طور پر لیتا ہے وہ اس وقت کی قیمت لیتا ہے جو قرضے کے دینے کے درمیان صرف ہوتا ہے۔ لیکن وقت خدا کی ملکیت تھا اور کسی انسان کو حق نہ تھا کہ وہ خدا کی ملکیت کو فروخت کرے۔ ع۔م

لیکن جب ایک دقیانوسی، رجعت پسند قوت تاریخ کی ترقی کو روکنے کی کوشش کرتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟ بالآخر پرانے خیالات اور عقیدوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی اس دور میں

ہوا۔کلیسا کے خدائی قوانین تاریخ کی نئی ضرورتوں کے سامنے پگھلنے لگے۔آہستہ آہستہ نئے ضابطے اس طرح بننے لگے:''سودی لین دین گناہ ہے،لیکن ان حالات میں.....''یا''سود کا روپیہ وصول کرنا گناہ ہے،تاہم خاص حالات میں.....''

اس طرح سودی لین دین کے متعلق قدیم نظریات مختلف طریقوں سے بدلتے ہوئے حالات سے مناسبت پیدا کرنے لگے۔یہاں تک کہ ایک فرانسی وکیل چارلس ڈومن (Charles Domoulin) نے سولہویں صدی عیسوں میں تجارتی ضروریات کے پیش نظر سودی لین دین کی محدود حد تک اجازت دینے کا مطالبہ کیا اور اس کے لئے قانون سازی کی سفارش کرتے ہوئے لکھا:

''روزمرہ کے تجارتی کاروبار میں ہم کو اچھی طرح محسوس ہوتا ہے کہ تجارت میں ایک معقول رقم کا استعمال اپنے اندر اچھا خاصا افادہ رکھتا ہے۔یہ خیال کہ روپیہ کوئی پھلنے پھولنے والی چیز نہیں معقول نہیں ہے۔جس طرح زمین کے لئے بھی کہا جاسکتا ہے کہ اراضی کا کوئی ٹکڑا جب تک آدمی اس پر اپنی محنت اور روپیہ صرف نہ کرے کچھ پیدا نہیں کرسکتا،اسی طرح روپیہ بھی ایک عرصہ تک کسی کام میں لگے رہنے کے بعد اور آدمی کی محنت اور صناعی کی بدولت ہی خاصی پیداوار کا موجب ہوتا ہے۔لیکن کبھی کبھی قرض دار کو اس زر قرض سے جو منافع ملتا ہے اس سے روپے کا اصل مالک بالکل محروم رہ جاتا ہے۔اس لئے سودی لین دین کی عام مخالفت،اس سے نفرت اور اس کے سلسلے میں سزاؤں کے قوانین شاید صرف اس قسم کے سودی لین کے لئے ہونا چاہئیں جو اپنی حد سے اتنا بڑھ جائے کہ اس میں کوئی معقولیت باقی نہ رہے۔لیکن محدود سودی لین دین اور معقول شرح سود پر جو قابل قبول ہو ان پر ان قوانین کا اطلاق نہیں ہونا چاہئے۔''

جب ارباب کلیسا کے نظریات جو انہوں نے سودی لین دین کے بارے میں قائم کر رکھے تھے ختم ہونے لگے اور روزمرہ کے تجارتی تقاضے راہ پانے لگے تو عقائد،قوانین،اخلاقی ضابطے،طرز معاشرت اور ذاتی تعلقات سبھی ان بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہونے لگے اور پورا سماج ترقی کی ایک نئی منزل میں داخل ہوا

MashalBooks.com

دہقان اپنی غلامی کی زنجیریں توڑتا ہے

ازمنہ واسطیٰ کے جاگیرداری نظام کی سب سے بڑی خوصیت یہ تھی کہ وہ جامد تھا۔اس دور میں جاگیردار اور اس کا نظام سرف دونوں مقررہ رسموں اور ضوابط پر عمل پیرا ہوتے تھے اور جن کے باعث سرف معاشی طور پر اپنی حالت بدلنے کی قوت نہیں رکھتا تھا۔لیکن تجارت کی ترقی اور روپیہ کے رواج نے زمانے کی کایا پلٹ دی،شہروں کے وجود میں آنے سے آزادی کی راہیں کھلیں تو اس کے ساتھ ہی جاگیرداری کے بندھن کمزور ہونا شروع ہوئے۔اب سرفوں کو بھی موقع ملا کہ وہ غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزادی حاصل کریں اور اپنی حالت بہتر بنائیں۔لیکن یہ عمل کوئی اتنا سیدھا سادا نہ تھا۔دراصل اس عمل کا آغاز اس وقت ہوا جب شہروں نے تجارتی مرکزوں کی حیثیت اختیار کر لی اور شہروں میں بسنے والے اپنے وقت کا بڑا حصہ تجارت اور صنعتی کاروبار پر ضرورت کے لئے وہ دیہات کے محتاج تھے۔اس طرح سے قدرتی طور پر شہروں اور دیہاتوں میں کاموں کی تقسیم ہوگئی۔شہروں نے تجارتی اور صنعتی پیداوار کا فرض سنبھالا اور دیہات زرعی پیدائش کی افزائش کی طرف،جس کی ضرورت میں خاص طور پر آبادی کے بڑھنے کے باعث دن بدن اضافہ ہو رہا تھا،پوری طرح متوجہ ہوگئے۔

زرعی پیداوار کے اضافے کی ضرورت نے جاگیرداری دور کے جمود کو توڑنے کے عمل کو مزید تیز کیا۔پیداوار میں اضافے کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ پیداوار ذرائع کو ترقی دی جاتی۔اس ترقی کی اولین صورت یہ تھی کہ زیر کاشت رقبوں میں اضافہ ہو۔صرف یہی نہیں بلکہ زیر کاشت رقبوں سے مزید پیداوار کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ اب نئے طریقے استعمال کئے جائیں،مثلاً اچھی کھاد استعمال ہو،بیجائی اور کھیت سینچنے کے ترقی یافتہ طریقوں کی تلاش کی جائے۔لیکن سب سے آسان گو سخت محنت طلب طریقہ یہی تھا کہ بنجر اور جنگلاتی علاقوں کو زیر کاشت لایا جائے۔اس زمانے میں مملکت فرانس کی آدھی اراضی،جرمنی کا تہائی علاقہ اور انگلستان کا صرف پانچواں حصہ زیر کاشت تھا۔ان ممالک کی باقی زمینوں پر بڑے بڑے جنگل کھڑے تھے۔بعض مقامات پر دلدلیں تھیں اور کہیں کہیں بنجر زمینوں کے وسیع رقبے پڑے ہوئے تھے۔اب سرفوں نے جاگیرداروں کی زمینوں سے بھاگ کر دور دراز جنگلات میں پناہ لینی شروع کر دی اور اپنے دست و بازو سے ان جنگلات کو صاف کر کے وہاں کاشتکاری شروع

کردی۔اس طرح سرف نے پہلی بار آزاد فضا میں سانس لے کر ایسی اراضی پر کاشت شروع کی جس کو وہ اپنی ملکیت کہہ سکتا تھا۔جب سرفوں کے بھاگنے کا رجحان زور پکڑنے لگا تو خود جاگیرداروں اور کلیسا نے بھی سوچا کہ وہ اپنے سرف کو آزاد کر کے اس کو اپنی غیر مزروعہ اراضی اونے پونے معاوضے پر دے دیں تا کہ اس سے کم از کم ان کو کچھ تو فائدہ ہوتا رہے۔چنانچہ ہمبرگ کے بشپ نے بارھویں صدی کے ابتدائی سالوں یعنی 1106 عیسوی میں ایک چارٹر کے ذریعے اعلان کیا:

''ہم چاہتے ہیں کہ اس معاہدے کو جو رائن دریا کے اس طرف رہنے والے بعض باشندوں نے ،جو ہولینڈرز کہلاتے ہیں ،ہم سے کیا ہے ،اسے عامتہ الناس کی اطلاع کے لئے مشتہر کر دیں۔یہ لوگ ہمارے پاس آئے اور انہوں نے ہم سے بہت عاجزی سے التجا کی کہ ہم ان کو اپنے کلیسا علاقے سے کچھ زمینیں جو غیر مزروعہ ،دلدلی اور ہماری رعایا کے لئے نا قابل استعمال ہیں عطا کر دیں۔ہم نے اپنی رعایا سے اس مسئلہ میں مشورہ لیا اور یہ یقین کر کے یہ معاہدہ ہمارے اور ہمارے جان نشینوں کے لئے نفع بخش ہو گا ہم نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ہمارے درمیان یہ طے ہوا کہ وہ ہمیں ایک سو بیس ایکڑ کے ہر ٹکڑے کے لئے ایک دینار سالانہ ادا کرتے رہیں گے۔ہم ان کو وہ چشمہ بھی جو اس اراضی سے ہو کر گذرتا ہے عطا کرتے ہیں۔مزید وہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ہمارے فرمان کے بموجب ہم کو عشر یعنی گیہوں کا ہر گیارھواں گٹھا ہر دسویں بھیڑ ،ہر دسواں سور ،ہر دسویں بکری ،ہر دسویں بطخ اور شہد اور کپاس کا دسواں حصہ دیتے رہیں گے۔وہ یہ بھی وعدہ کرتے ہیں کہ ان پر بارہ ہزار ایکڑ زمینوں کے رقبوں کے لئے جہاں وہ اپنے دنیاوی امور کے متعلق اپنی عدالتیں قائم کریں گے ،ہم کو دو مارک سالانہ ادا کرتے رہیں گے۔''

ہیمبرگ کے بشت نے ہولینڈرز سے یہ معاہدہ صرف یہ سمجھ کر کیا تھا کہ ''یہ ہمارے اور ہمارے جانشینوں کے لئے نفع بخش ہو گا۔'' دوسرے کلیسائی اور دیگر اراضی کے مالکان نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اگر ان کی بیکار اراضی ان محنت کشوں کے ذریعے کارآمد بن جائیں تو یہ بہت نفع بخش ہو جائیں گی اور یہی محنت کش ان کو ان زمینوں کا محصول بھی ادا کریں گے۔ان مالکان اراضی میں سے بہت سے منچلوں اور عاقبت اندیش مالکوں نے یہ بھی انتظار نہیں کیا کہ لوگ ان

کے پاس خود آئیں اور عاجزی سے زمین کو قابل استعمال بنانے کو بھیک مانگیں۔انہوں نے خود ہی پہل کی اور چاروں طرف اشتہار دینا شروع کر دیا کہ وہ اپنی زمینیں ان لوگوں کو محصول پر دیں گے جو ان ناکارہ زمینوں کو قابل کاشت بنالیں گے۔چنانچہ ایسے جاگیرداروں نے ان زمینوں پر جن کو ابھی تک کسی نو آبادکار کے ہاتھوں نے چھوا بھی نہ تھا گاؤں بسا بسا کر اچھا خاصا نفع کمایا اور ہزاروں ایکڑ اراضی جو بیکار پڑی ہوئی تھی اب کاشت کاری کے کام آنے لگی۔چنانچہ سائلیز یا کے علاقہ 1350 عیسوی میں پندرہ سو بستیاں آباد ہوئیں اور ان بستیوں میں قریب ڈیڑھ دو لاکھ نو آبادکار کاشت کاری کرتے تھے۔یہ غیر معمولی توسیع بہت اہم تھی،اور یہ حقیقت بھی کچھ کم اہم نہ تھی کہ اب سرفوں کو ایسی زمینیں مل سکتی تھیں جو آزاد تھیں یعنی جن کے ساتھ بیگار اور نذرانے کی قید نہ تھی بلکہ سالانہ محصول ادا کر کے ان پر کاشت کی جاسکتی تھی۔آزادی کی یہ نئی لہر اپنی نوعیت میں بالکل نئی تھی۔سالہا سال سے نہیں بلکہ صدیوں سے یہ کاشتکار جو یورپ میں سرف کے نام سے پکارا جاتا تھا اپنی قید اور بدقسمت زندگی پر صبر شکر کرتا چلا آرہا تھا۔وہ ایسے نظام میں پیدا ہوا تھا جس میں سماج کی طبقہ وار تقسیم بہت پختہ اور واضح تھی،اس کو یہی سکھایا گیا تھا کہ وہ آسمان کی بادشاہت یعنی جنت میں اسی وقت داخل ہو سکے گا جب وہ سماج کی،جو پروہتوں،جنگ آزماؤں اور محنت کشوں پر مشتمل تھا،بلا حیل و حجت خدمت بجالاتا رہے۔لیکن اب تجارت کی وسعت نے اس کی دنیا بھی بدل دی تھی۔اب وہ اپنی زائد پیداوار کو شہر میں لے جاتا اور اس کے عوض روپیہ حاصل کرتا۔اس نئی صورت حال نے اس کے لئے ترقی کی نئی راہیں کھول دیں،کیونکہ اب اگر وہ پہلے سے زیادہ محنت کرتا اور اپنی ضرورت سے زیادہ فصل پیدا کرتا تو وہ اس قابل ہو سکتا تھا کہ کچھ رقم پس انداز کر لیتا اور اپنے مالک کو اپنی غلامی کی کچھ قیمت ادا کر کے اپنے آپ کو آزاد کرا سکتا تھا 'اور اگر مالک انکار کرے تو شہروں میں بھاگ کر وہ پناہ لے سکتا تھا۔

دولت کمانے کے نئے مواقعوں نے جاگیرداروں کو بھی بدلنے پر مجبور کیا اور وہ بھی اب روپے کی صورت میں معاوضہ لے کر اپنے سرف کو آزاد کرنے پر تیار ہو جاتے۔ویسے بھی انہیں خوف رہتا کہ سرف اگر بھاگ گیا تو وہ سرف سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور معاوضے کا روپیہ بھی اس کے ہاتھ نہیں لگے گا۔لیکن کوئی بھی طبقہ ہو،خواہ وہ مظلوم طبقہ ہو یا ظالموں کا،ان میں تبدیلیاں بہت ہی آہستہ آہستہ آتی ہیں اور دنیا کی تاریخ کے ہر دور میں ایسے لوگوں کی کثرت رہی ہے جو وقت کے ساتھ تبدیل ہونے کے عمل کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔اکثر لوگ تو ضروری

اور لازمی تغیرات کے وقت اپنے ماضی سے بہت بری طرح چمٹ جاتے ہیں۔ چنانچہ قرون وسطیٰ میں جب تبدیلیوں کی ہوائیں چل رہی تھیں تو اس وقت ایسے لوگوں اور مالکوں کی کمی نہ تھی جو اپنے سرفوں کو کسی طرح آزاد کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ جو لوگ یہ رجحان رکھتے تھے ان میں ارباب کلیسا عام مالکان زمین سے کہیں آگے آگے تھے۔ حتیٰ کہ جب مالکوں کی اچھی خاصی اکثریت نے کہ محسوس کر لیا کہ خود ان کی مالی منفعت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ سرفوں کو آزاد کر دیں اور اجرتی مزدوروں سے کاشت کاری کروائیں تو اس وقت بھی ارباب کلیسا سرفوں کی آزادی کے شدید دشمن تھے۔ چنانچہ کلونیک (Cluniac) نامی مذہبی مسلک کی کتاب القوانین میں یہ فرمان شامل تھا جو 1320 عیسوی میں کلیسا کی طرف سے جاری کیا گیا تھا:

''ہم ان لوگوں کو عیسائی برادری سے خارج کرتے ہیں جو سرفوں، غلام مردوں، غلام عورتوں یا ایسی غلام عورتوں کو جو کلیسائی حلقے سے متعلق ہیں، آزاد کرتے ہیں''

پھر اس فرمان کے 138 برس بعد 1458 میں ایک اور فرمان کلیسا کی طرف سے نافذ کیا جس میں کہا گیا ''تمام صدر راہب، نائب صدر راہب، گرجوں کے افسران اعلیٰ اور دوسرے انتظامی شعبوں کے عہدہ دار جو سرف اور غلام رکھتے ہوں صاف صاف قسم کھائیں کہ وہ ان سرفوں کو جو ان کے قبضے میں ہوں ہرگز آزاد نہ کریں گے۔''

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب اہل کلیسا کے تمام فتووں کے باوجود آزادی کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا اس کی کرنیں افق سے ابھرنے لگی تھیں۔ پھر بھی آزادی کی لگن اور کلیسا کے ان فتووں کے درمیان تضاد نے سماج میں اور لوگوں کے دلوں میں ایک کشاکش ضرور پیدا کر دی۔ آزادی کو روکنے کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرفوں اور کاشت کاروں کو اکثر اپنی آزادیاں حاصل کرنے کیلئے لڑنا پڑا۔ لڑ بھڑ کر اپنی آزادی کے مواقع بڑھانے میں جن عوامل کا ہاتھ تھا ان میں سب سے اہم واقعہ طاعون کی وبا کا پھوٹ پڑنا تھا جسے اس دور میں Black Death کہا جاتا تھا۔ اس وبا نے قرون وسطیٰ کے پورے یورپ کے براعظم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور دو سالوں (1348-1350) میں اتنے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جتنے بیسویں صدی کی پہلی جنگ عظیم کے ہولناک قتل عام میں مارے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ محنت کرنے والوں کی تعداد میں شدید کمی واقعہ ہوگئی اور جو لوگ اس وبا سے بچ نکلے ان کی قیمت بہت بڑھ گئی۔ جاگیرداروں اور کلیسا نے جب اس حقیقت کو قبول کرنے سے انکار کیا تو بغاوتوں کا ایک سلسلہ پھوٹ نکلا۔ یورپ

میں کسان بغاوتیں پہلے بھی ہوتی تھیں، لیکن چودھویں صدی کی بغاوتیں مختلف تھیں۔ کسانوں کو اب اپنی قدر و قیمت کا اندازہ ہو گیا تھا اور وہ قوت کے ذریعہ اپنے حقوق اور آزادیاں حاصل کرنے کی پوزیشن میں تھے۔

مورخین ان بغاوتوں کے وجوہ و اسباب کے بارے میں متفق الرائے نہیں ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ مالکان زمین نے کسانوں کو مجبور کرنا شروع کیا تھا کہ وہ پھر سرفوں کی طرح ان کے کھیتوں میں کام کریں۔ لیکن مورخین کا دوسرا گروہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ مالکان زمین نے اس زمانے میں بھی جب کسانوں میں آزادی کی تڑپ روبہ عروج تھی ان کو رسمی بیگار سے آزاد نہیں کیا تھا اور بغاوتیں اس بیگار کے خلاف تھیں۔ بہر حال مخصوص وجوہات جو بھی ہوں اس زمانے کی دستاویزات ہمیں بتاتی ہیں کہ مالکان زمین اور کسانوں دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف تشدد کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ ریکارڈ تباہ کئے گئے، جائیدادیں جلائی گئیں، کسان بھی بے دردی سے قتل کئے گئے یا پھانسیوں پر چڑھائے گئے، اور ان پر جبر و استبداد کرنے والے مالکان زمین اور ان کے مالی موالی بھی تلوار کے گھاٹ اتارے گئے۔

یہ درست ہے کہ بالآخر کسانوں کی بغاوتیں ایک حد تک فرو کر دی گئیں، لیکن اس کے باوجود دیہات میں انقلاب کی رفتار کو نہ روکا جا سکا۔ پرانے جاگیرداری نظام کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ پندرھویں صدی کے وسط تک مغربی یورپ میں ہر جگہ سرف غلام مزدوروں میں تبدیل ہو گئے جو روپیہ کے عوض کرائے پر لئے جاتے تھے اور اکثر جگہ کسان مکمل طور پر آزاد ہو گئے۔

جاگیردری سماج میں زرعی زمین کا کاروبار ایک نامانوس عمل تھا لیکن اب بدلے ہوئے حالات میں یہ کاروبار عام ہو گیا۔ پرانے زمانے میں زمین اکثر باہمی خدمات کی بنیاد پر عطا کی جاتی تھی۔ لیکن اب صورت حال بدل گئی اور زمینی جائیداد کا ایک نیا تصور پیدا ہو گیا۔ اب یورپ میں کسانوں کی بہت بڑی تعداد آزادی سے گھوم پھر رہی تھی۔ وہ زمین خریدتے بیچتے تھے اور وصیت کے ذریعے سے اسے دوسروں تک اپنی مرضی سے منتقل کرتے تھے، اگرچہ ان کو ایسا کرنے کے لئے ایک خاص رقم ادا کرنی پڑتی۔ چنانچہ اب زمین بھی ایک تجارتی چیز بن گئی تھی جس کو خرید و فروخت کیا جا سکتا تھا۔ اس نئی صورت حال نے قدیم جاگیرداری دنیا کا خاتمہ کر دیا۔ انقلابی قوتیں مغربی یورپ پر چھا چکی تھیں اور اب دنیا نیا چولا بدل رہی تھی۔

MashalBooks.com

دستکاروں کی انجمنیں

یورپی جاگیرداری دور میں انسانوں کی ضروریات کے لئے جس قسم کی دست کاری کی ضرورت ہوتی تھی وہ کسان خود اپنے گھر میں ہی کر لیتا تھا، البتہ جاگیرداروں، امراء اور کلیساؤں کے پاس کچھ ایسے ضاع رہتے تھے جو کسی مخصوص صنعت میں ماہر ہوتے تھے اور وہ امرا اور کلیسا کی ضرورت کی اشیاء تیار کرتے تھے۔ یہ اشیاء بازار میں بکنے کے لئے نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن جب شہر آباد ہوئے اور وہاں تجارت اور روپے کی ریل پیل شروع ہوئی تو پھر یہی صناع اور دستکاریوں کے ماہر فارموں اور دیہاتوں کو چھوڑ کر شہروں میں منتقل ہونے لگے۔ ان کو اس دور میں اپنی صنعت کے لئے بڑے سرمائے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ صناع جس گھر میں خود رہتا تھا اسی کے ایک کمرے میں وہ اپنا کارخانہ لگا لیتا تھا۔ اسے صرف اپنے کام میں معمولی مہارت اور چند خریداروں کی ضرورت ہوتی تھی، اور اگر وہ اچھا کاریگر ہوتا تو اس کی شہرت شہر میں پھیل جاتی اور جب اس کی اشیاء کی طلب بڑھنے لگتی تو وہ اپنے ساتھ کچھ مددگار رکھ لیتا جن کو ساتھ ساتھ وہ کام بھی سکھاتا جاتا تھا۔ وہ جو اشیاء تیار کرتا اس کو خود ہی دکانداروں کو فروخت کے لئے دے آتا۔ جیسے جیسے ان دستکاروں کی تیار کردہ اشیاء کی مانگ بڑھنے لگی ویسے ویسے چھوٹے چھوٹے صنعتی کارخانے وجود میں آنے لگے۔

اس زمانے میں صنعتی نظام جس نوعیت کا تھا اس کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کی مصنوعات پیشہ ور ماہرین بناتے تھے جو خام مال کے بھی مالک ہوتے تھے اور ان اوزاروں کے بھی جو ان مصنوعات کو بنانے میں استعمال ہوتے تھے۔ یہ صورت حال ہمارے آجکل کے صنعتی نظام سے بالکل مختلف ہے۔ آجکل جو لوگ صنعتی اشیاء بناتے ہیں وہ نہ ہی خام مال کے مالک ہوتے ہیں نہ ہی اپنے اوزاروں کے۔ وہ اپنی بنائی ہوئی اشیاء خود فروخت نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ بھی ان کی ملکیت نہیں ہوتیں۔ وہ صرف ایک چیز کے مالک ہوتے ہیں اور وہ ہے ان کی محنت کرنے کی طاقت۔

ان دستکاروں نے سوداگروں کی مثال پر عمل کرتے ہوئے (جن کا عروج ان سے پہلے کے زمانے میں ہوا تھا) اپنی الگ گلڈز (انجمنیں) بنانا شروع کر دیں۔ ایک شہر میں کام کرنے

والے تمام وہ لوگ جو ایک قسم کی دستکاری کرتے تھے وہ آپس میں مل کر ایک تنظیم بنا لیتے جس کو دستکاری گلڈ کہا جاتا تھا۔ اس انجمن میں صرف استاد دستکار ہی شامل نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ تمام لوگ تھے جو استاد کے ساتھ کام کرتے تھے۔ مثلاً اس کے شاگرد اور اس کی بنائی ہوئی چیزوں کو لے جا کر بیچنے والے۔ سب اس صنعت کو اپنا سمجھتے تھے اور ایک ہی سے حقوق کے لئے لڑتے تھے۔ اس لئے ممکن تھا کہ۔ آجکل کی صورت حال کے خلاف۔ اس زمانے میں مالک اور مزدور کے درمیان وہ فرق نہیں تھا جو اب ہے۔ دراصل وہ سب رہتے اور کھاتے پیتے بھی ساتھ ساتھ تھے (پاکستان اور ہندوستان میں بہت عرصے تک ایسا ہی نظام رہا اور اب بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے ع۔م)

گلڈز کی نوعیت کے بارے میں ہمیں چمڑے کے دستکاروں کے (جو اس زمانے میں یورپ میں ایک بڑی صنعت تھی) ایک اور ڈیننس سے کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ یہ اور ڈیننس 1346 میں جاری ہوا تھا:

1۔ اگر کسی وجہ سے کسی ممبر کا کاروبار بگڑ جائے یا وہ غریب ہو جائے یا بڑھاپے کی وجہ سے کام نہ کر سکے یا کسی اور وجہ سے محنت کے لائق نہ رہے تو اسے ہر ہفتے 7 شلنگ زندگی بسر کرنے کے لئے ادا ہوتے رہیں گے بشرطیکہ اس کی شہرت خراب نہ ہو۔

2۔ کسی اور اجنبی کو جو اس کاروبار میں بطور شاگرد (Apprentice) کے کام نہ کر رہا ہو گا یا اس کو شہر میں حق رائے دہندگی حاصل نہ ہو گا، اس کام کرنے کی اجازت نہ دیجائے گی۔

3۔ کوئی دست کار کسی دوسرے دست کار کے ساتھ کام کرنے والے کو اپنے ساتھ کام پر نہیں لگائے گا جب تک کہ اس کی پہلے دستکار کے ساتھ کام کرنے کی میعاد پوری نہ ہو جائے۔ اگر کوئی شخص ایسا کرے گا تو اس کے لئے پہلے مالک کی اجازت حاصل کرنا ضروری تصور ہو گا۔ اور اگر دستکاری کے اس شعبے میں کوئی ایسا ہو گا جو اپنے کارخانے کا کام پورا نہیں کر سکتا تو اس شعبے سے تعلق رکھنے والے دوسرے لوگ اس کام کو نبٹانے میں اس کی مدد کریں گے۔

4۔ اگر کوئی کام کرنے والا آدمی اپنے آقا اور دستکار کے ساتھ نامناسب رویہ اختیار کرے گا یا اس کے احکام کی خلاف ورزی کرے گا اور باغیانہ طرز عمل اختیار کرے گا

ایسے شخص کو کوئی بھی دست کار کام پر نہیں لگائے گا تاوقتیکہ وہ بلدیہ کے صدر یا نائب صدر کے سامنے پیش ہو کر اپنی کوتاہیوں کا اعتراف نہیں کرتا اور اسکا کفارہ ادا نہیں کرتا۔

5۔اس دستکاری شعبے کے ذمہ دار لوگ سال میں ایک مرتبہ دو آدمیوں کا انتخاب کریں گے جن کے ذمے تجارت سے متعلق تمام امور کی نگرانی ہوگی۔ یہ لوگ صدر بلدیہ کے رو برو باقاعدہ حلف اٹھائیں گے کہ وہ تمام امور کی نگرانی کمال دیانت، جرات اور ذمہ داری کے ساتھ ادا کریں گے اور اس دوران نہ دوستوں کی رعایت کریں گے اور نہ وہ دشمنوں سے بدلہ چکانے کی کوشش کریں گے۔

6۔کسی ایسے شخص کو جس نے کسی پیشے میں شاگردی نہیں کی ہو یا شاگردی کی مدت پوری نہیں کی ہو اسے یہ پیشہ اختیار کرنے کی آزادی نہیں دی جائے گی۔

اس قسم کی ہزاروں تحریروں اور دستاویزات کے مطالعے سے تجزیہ نگاروں نے قرون وسطیٰ میں پروان چڑھنے والی دستکار تنظیموں کے حالات مرتب کئے ہیں اور ان دستاویزات سے بعض واضح امور کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ جماعتیں وجود میں ہی اس لئے آئی تھیں کہ وہ اپنے ہم پیشہ لوگوں کی امداد کریں، ان میں ڈسپلن پیدا کیا جائے اور صنعت کو باقاعدہ ضابطوں اور اصولوں کا پابند بنایا جائے، اور جماعت کے ہر ممبر کے مفاد کی حفاظت کی جائے۔ بے روزگاری کیلئے انشورنس اور بوڑھوں کے لئے پنشن جو جدید خیالات ہیں، ان گلڈز نے چار سو سال پہلے ہی اپنا لئے تھے! آہستہ آہستہ یہ انجمنیں ایسی موثر قوانین اور ضابطوں کی پابند ہوگئیں کہ ان پر مافیا ہونے کا شبہ ہونے لگا لطف یہ ہے کہ جماعتوں کی تنظیم کا احساس اور رواج اس قدر بڑھ گیا کہ بال (Basle) اور فرینک فرٹ (Farnkfurt) کے گداگروں نے بھی اپنی گلڈز منظم کرلیں یہ انجمنیں اپنے شہروں میں کسی دوسرے شہر کے بھکاری کو دو دنوں کے علاوہ بھیک مانگنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ وقت کے ساتھ گلڈز کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ کلیسا کو بھی جو نہایت طاقتور ادارہ تھا ان کے قواعد وضوابط کا احترام کرنا پڑا۔ چنانچہ 1448 میں جرمن کے چرچ سینٹ یوہان کے سربراہ پادریوں کی خواہش ہوتی کہ وہ اپنے کلیسا کی اراضی سے پیدا ہونے والی گندم اور رائی کی روٹیاں پکوائیں تو ان کو باقاعدہ نانبائیوں کی انجمن (BakersGuild) سے اجازت لینی پڑی۔

MashalBooks.com

لیکن اس کے ساتھ دستکاروں کی انجمنوں نے ایک اور جدت بھی کی اور ایک نئی ذمہ داری اپنے اوپر لگائی جس نے یورپ کے صنعتی کلچر کو اعلیٰ بنانے میں ایک بنیادی کردار ادا کیا۔ جس ''جدت'' کا ہم ذکر کر رہے ہیں اسے آج کل ''کوالٹی کنٹرول'' کہا جاتا ہے۔ مندرجہ بالا قوانین میں شامل نمبر 5 اور 6 پر غور کیجئے۔ گلڈز یہ واضح کر رہے ہیں کہ جس قسم کی اجارہ داری وہ اپنے ہاتھوں میں سمیٹ رہے ہیں اس کے عوض وہ عوام کو اچھی سروس دیں گے۔ ان کو اس بات کی فکر تھی کہ ان کے ممبر دستکاروں کے کام کی کوالٹی عمدہ ہو۔ اس لئے ایک قانون تو انہوں نے اپنے اوپر یہ لگایا کہ کسی ایسے شخص کو پیشہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی جس نے پہلے شاگردی نہیں کی ہو اور کام کو باقاعدہ طور پر نہ سیکھا ہو۔ دوسرے قانون کا مقصد یہ تھا کہ ممبروں کے کام کی نگرانی کے ذریعہ یہ یقین کیا جائے کہ گاہک کو اس کے پیسے کے عوض گھٹیا قسم کی چیز نہیں ملے گی۔ گلڈز کو اپنے کام کے اعلیٰ پن پر فخر ہوتا تھا۔ دراصل انہوں نے کوالٹی کا معیار بلند رکھنے کیلئے ایک نہیں ہزاروں قوانین بنائے تھے۔ گلڈز کے سپروائزر فیکٹریوں کا انسپکشن کرنے کیلئے سے دورے کرتے تھے اور یہ چیک کرتے تھے کہ ممبر ناپ تول کے جو اوزان استعمال کرتے ہیں وہ صحیح ہیں یا نہیں، کس قسم کا خام مال استعمال کرتے ہیں، اور ان کی ساخت شدہ چیزیں معیاری ہیں یا نہیں۔

گاہکوں کو دھوکہ بازی سے محفوظ رکھنے کیلئے کچھ گلڈز اپنی مصنوعات پر ''منصفانہ قیمت'' کا ٹھپہ لگایا کرتے تھے۔ منصفانہ قیمت کیا تھی اس کو سمجھنے پر ہمیں یہ بھی اندازہ ہوگا کہ سماج میں مروجہ اچھے اور برے کے معیار نے کس حد تک معاشیات پر بھی اثر کیا تھا۔ بزنس کے لین دین میں اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ بیچنے اور خریدنے والوں میں سے کسی پارٹی کو ایک دوسرے سے زیادہ فائدہ نہ ہو۔ گلڈز ایمانداری سے قیمت لاگت کی بنیاد پر مقرر کرتے تھے اور کسی ممبر کو اجازت نہیں تھی کہ وہ اس سے ایک پینی بھی زیادہ وصول کرے۔ اس ضمن میں مشہور مذہبی مفکر سینٹ ٹومس اکوائنس (St. Thomas Aquinas) بڑے زوردار الفاظ میں لکھتے ہیں:

> ''عوام کے مفاد کیلئے تجارت کا جو عام طریقہ مقرر کیا گیا ہے، اسے ایک کے لئے زیادہ نفع بخش اور دوسرے کے لئے کم نفع بخش نہیں ہونا چاہیے۔ چیز کی قیمت اس کی اصل لاگت سے بڑھ جائے یا گھٹ جائے دونوں حالتوں میں مطلوبہ شرط پر پوری نہیں اترتی اور ایسا کرنا خلاف قانون ہے''

اس کاروباری کا کیا حشر ہوتا تھا جو منصفانہ قیمت سے زیادہ پر اشیاء بیچ کر راتوں

رات امیر بننے کی کوشش کرتا تھا؟ قرون وسطیٰ کے عوام اس کو کس طرح روکتے تھے اس کا علم ہمیں مندرجہ ذیل واقعہ سے ہوتا ہے:

''چنانچہ جب روٹی کی قیمت بڑھتی ہے یا لندن میں جب پھل بیچنے والے اس احساس سے مجبور ہو کر کہ وہ محض غریب اور سادہ مزاج ہونے کی وجہ سے نقصان میں ہیں اور اگر وہ نفع اندوزوں کا مشورہ قبول کر کے اقدام کریں تو مالدار اور طاقت ور ہو سکتے ہیں' اجتماعی طور پر پھلوں کی قیمت بڑھا دیتے ہیں تو شہری اور کسان محض اس امید میں نہیں بیٹھے رہتے کہ سپلائی اور مانگ کے اصول چیزیں سستی کر دیں گے بلکہ وہ تمام اچھے عیسائیوں کی تائید سے مضبوط ہو کر اٹھتے ہیں اور آٹے کی چکی کے مالکوں کو عدالت کے کٹہرے میں لے جاتے ہیں اور پھل والوں کو بلدیہ کے صدر کے اجلاس میں بلا کر ان سے جواب طلب کرتے ہیں۔''

بہر حال منصفانہ قیمت کا تصور صرف چھوٹے مقامی اور جمے ہوئے بازار کی اقتصادیات کے دائرے میں ہی ممکن تھا۔ لیکن یہ ایسے اقتصادی نظام کے لئے موزوں نہیں ہوگا جس کا احاطہ بہت بڑا ہے اور جو کسی مخصوص حلقے میں محدود نہیں ہوتا۔ جیسے جیسے معاشی حالات بدلے اور تجارت یورپ کے کونے کونے میں اور اس سے باہر پھیلی ویسے ویسے تجارت کے اصول بھی بدلنے لگے اور نئے معاشی نظریات نے جنم لیا۔

اگر چہ حالات میں تغیر خاصہ نمایاں طور پر ہو رہا تھا لیکن عوام کو اس تغیر و تبدل کے محسوس کرنے میں کافی وقت لگا، اور محسوس کرنے کے بعد ان نئے حقائق کو تسلیم کرنے میں اور بھی دیر لگی۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ بنیادی حقیقتیں بدل جاتی ہیں لیکن لوگ عرصے تک پرانی، دقیانوسی اور فرسودہ روایات سے چمٹے رہتے ہیں، حالانکہ وقت اور اس کی ضرورتیں ان خیالات و روایات کو ایک زمانے سے متروک اور بے کار قرار دے چکی ہوتی ہیں۔ قرون وسطیٰ کے آخری دور میں تجارت کے انداز میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں انہوں نے نئے حالات، نئی طرز حیات اور نئے معاشی تصورات کو جنم دیا۔ چنانچہ چودھویں صدی عیسوی میں پیرس یونیورسٹی کا ریکٹر، ژان بوری داں (Jehan Buridan) لکھا:

''کسی چیز کی قیمت اس کی ذاتی حیثیت (Intrinsic worth) کو دیکھ کر مقرر نہیں کرنا چاہیے، بلکہ یہ ضروری ہے کہ اس کی قیمت کے تعین کے وقت انسانی

ضرورتوں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے ۔ جو شے جس حد تک انسانی ضروریات کو پورا کرتی ہے اسی حد تک وہ قیمتی ہے۔''

یہ اصول ''سپلائی اور ڈیمانڈ'' (Supply and demand) کے معاشی نظریئے کی روح ہے، جسے تین سو سال بعد ایڈم سمتھ نے مشہور کیا۔

قیمت کے تصور میں جو تغیر رونما ہوا اس نے گلڈز پر بھی بہت اثر ڈالا اور دیکھتے دیکھتے وہ دست کار دولت مند بننے لگے جو گاہک کی ضرورتیں جلدی اور زیادہ تعداد میں فراہم کر سکتے تھے ۔ بلکہ ان کا ایک الگ طبقہ پیدا ہو گیا۔ اور جو دستکار کسی وجہ سے اس عمل میں پیچھے رہے وہ غربت کا شکار ہوئے اور کارندہ اور آجر کی صورت میں دوسرے دستکاروں کے کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور ہو گئے ۔ اس صورت میں گلڈز کمزور پڑنے لگیں اور ان کا انحطاط ہونے لگا۔

MashalBooks.com

یورپ میں قومیں ابھرتی ہیں

اب تک ہم جس دور کا ذکر کر رہے تھے یعنی دسویں سے لے کر چودھویں صدی کے آخر تک اس زمانے میں گو یورپ مختلف ملکوں میں بٹا ہوا تھا، لیکن ملکوں کی یہ تشخیص محض رسمی تھی۔ کلچر اور سماجی اعتبار سے یورپ میں دو مختلف قسم کے حالات رائج تھے اور دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ایک طرف تو یورپ کیا کلچر یکساں تھا، یعنی ہر جگہ ایک ہی زبان (لاطینی) بولی جاتی تھی، ایک ہی مذہب (رومن کیتھولزم) کی پیروی کی جاتی تھی، اور دراصل سیاسی طور پر بھی کیتھولک چرچ کا غلبہ پورے یورپ پر تھا۔

دوسری طرف، یورپ چھوٹے چھوٹے علاقوں، راجواڑوں اور شہروں میں بٹا ہوا تھا۔ لوگوں کی اصل زندگیاں انہی کے دائروں میں محدود تھیں۔ ان کی سوچ مقامی تھی۔

لیکن جیسا کہ ہم پچھلے بابوں میں دیکھتے آئے ہیں اس پورے دور میں زبردست تبدیلیاں آرہی تھیں جو زندگی کے ان تنگ دائروں کو توڑ رہی تھیں۔ یہ تبدیلیاں پہلے معاشی سطح پر ظاہر ہوئیں، پھر رفتہ رفتہ زندگی کے ہر شعبے میں پھیل گئیں۔ پندرھویں صدی کے دوران یورپ میں جو تبدیلی نمایاں ہوتی ہے وہ تھی قوموں کا عروج۔ لوگوں نے مقامی سطح سے بالاتر ہو کر قومی سطح پر سوچنا شروع کر دیا۔ علاقائی سرحدوں کی اہمیت کم ہوگئی اور قومی سرحدوں پر زیادہ توجہ دی جانے لگی اور ان کا تعین کیا جانے لگا۔ قومی زبانوں کا عروج ہوا، اور ان کے ساتھ ساتھ قومی ادب پیدا ہونے لگا۔ معاشی زندگی کیلئے مقامی قوانین کی جگہ قومی سطح پر قوانین مقرر کئے جانے لگے۔ یہاں تک کہ قومی کلیسائیں نمودار ہونے لگیں۔ لوگ اب اپنے آپ کو میڈرڈ والے یا کینٹ والے کہنے کی بجائے ہسپانوی یا انگلستانی یا فرانسیسی کہنے لگے۔

قومی ریاستوں کے عروج کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما تھے؟ اس مسئلے پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ یہاں صرف چند ایک عوامل کا تذکرہ کرنے کی ہی گنجائش ہے۔

دسویں اور پندرھویں صدیوں کے دوران جو سب سے زبردست تبدیلی ظاہر ہوئی تھی وہ تھا نئے دولتمند درمیانہ طبقوں کا عروج۔ ان طبقوں کی سب سے بڑی ضرورت تھی اپنی دولت

حفاظت۔ دوسرے الفاظ میں انہیں ایسے ادارے درکار تھے جو اس علاقے کا جہاں وہ کاروبار کرتے تھے نظم ونسق ٹھیک کرسکیں اور ان کو رہزنوں اور جگہ جگہ کے محصولوں سے نجات دلاسکیں۔ یہ کام کون کرسکتا تھا؟ زمانے میں یہ ذمہ داری تھی جاگیرداروں اور نوابوں کی۔ لیکن درمیانہ طبقوں کو خاص طور پر انہیں سے تحفظ درکار تھا۔ نہ صرف یہ کہ یہ جاگیردار طرح طرح کے محصول لگاتے تھے، بلکہ اکثر انہیں کے لوگ ڈالہ زنیوں اور رہزنیوں میں ملوث تھے۔ پھر بڑی بات یہ کہ یہ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے اور ان کی جنگیں مستقل بدامنیاں پھیلاتی رہتی تھیں جس کے باعث دستکاروں اور سوداگروں کو اپنے مال وجان کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ چنانچہ اب سب سے اہم ضرورت ایک مرکزی حکومت اور ایک قومی ریاست کی تھی جو چھوٹے جاگیرداروں کی قوت توڑ کر پورے علاقے کو، لاء اینڈ اورڈر کے لئے بھی اور ٹیکسوں کے انتظام میں یکسانیت لانے کے لئے بھی، ایک اوتھوریٹی (Authority) کے کنٹرول میں لائے۔

مرکزی حکومت کا عروج آسانی سے اور جلد نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں کبھی پیش رفت ہوتی کبھی پیچھے ہٹنا پڑتا۔ یہ کوئی باشعور منظّم تحریک نہیں تھی بلکہ سماج کے تقاضے تاریخ کو اس طرف دھکیل رہے تھے اور قومی ریاستوں کو ابھرتے ابھرتے کوئی پچاس سو سال نہیں بلکہ صدیاں لگیں۔

نواب اور جاگیردار پہلے ہی کمزور ہو رہے تھے، کچھ تو اس لئے کہ زمین اور سرف دونوں ان کے ہاتھوں سے نکلنے لگے تھے، کچھ آپس کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے۔ پھر جب شہروں کا عروج ہوا تو ان کی طاقت اور بھی ٹوٹ گئی۔ شہروں اور جاگیرداروں کے مابین تصادم میں بادشاہ نے شہریوں کا ساتھ دیا۔ چنانچہ جتنی قوت جاگیرداروں کی کم ہوتی گئی اس حساب سے بادشاہ طاقتور ہوتا گیا۔ شہر اس مدد کے معاوضے میں جو وہ بادشاہ سے حاصل کرتے تھے روپیہ قرض دیتے اور بادشاہ اس روپے سے براہ راست فوجی رنگروٹ بھرتی کرکے جاگیردار سے بے نیاز ہو جاتا۔ جاگیرداروں کے سپاہی غیر تربیت یافتہ اور عارضی ہوا کرتے تھے۔ اب بادشاہ کے فوجی رنگروٹ کل وقتی ہونے لگے، ان کی باقاعدہ تربیت شروع ہوئی اور فوجی تربیت ان کا پیشہ بن گیا۔ ان کو باقاعدہ تنخواہ ملتی اور ان کا باقاعدہ تربیتی نظام استوار ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ فوجی ہتھیاروں میں بھی ترقی ہونے لگی اور دستکار بھی اس میدان میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرنے لگے۔ اس طرح بارود اور توپوں کا زمانہ آگیا۔

بادشاہ ان تجارتی اور صنعتی جماعتوں کا شدید احسان مند تھا کیونکہ اس طبقے نے مالی مدد و

اعانت سے بادشاہ کو ایک طرف جاگیرداروں کے مقابلے میں خود مختار کر دیا دوسری طرف ایک ترتیب یافتہ فوج کی تنظیم سے اس کے اثر ورسوخ میں اضافہ ہوا۔ اس زمانے میں بادشاہوں کا تاجر طبقے پر کس قدر انحصار ہونے لگا تھا اس کا اندازہ چودھویں صدی کی ایک دستاویز سے ہوتا ہے جس میں شاہ انگلستان کی طرف سے لندن کے شہریوں اس مدد مانگنے کا تذکرہ ہے:

''سر روبرٹ ڈی ایشبی، جو ہمارے آقا بادشاہ کے منشی ہیں، لندن کے گلڈ ہال میں تشریف لائے اور انہوں نے بادشاہ کی طرف سے صدر بلدیہ انڈریو اوبری کو پیغام پہنچایا کہ وہ ان کے نائب ہمارے بادشاہ اور اس کی کونسل کے سامنے حاضر ہوں..... بادشاہ نے سمندر پار کی لڑائی میں جن مصارف کا بار اٹھایا ان کا زبانی ذکر کیا اور جو مصارف آئندہ ہونے والے ہیں ان کا بھی ذکر کیا، اور 20 ہزار پاؤنڈ سٹرلنگ کے قرضے کی درخواست کی... بلدیہ نے 5 ہزار مارک دینے کا وعدہ کیا اور اس سے زیادہ سے معذوری کا اظہار کیا... ہمارے آقا بادشاہ نے اسے قطعی مسترد کر دیا اور میئر (اور بلدیہ کے دوسرے عہدہ داروں) کو یاد دلایا کہ وہ ان کی اطاعت اور وفاداری کی قسم کھا چکے ہیں اور اس لئے اس معاملے پر دوبارہ غور کریں... اور گو یہ کام بہت دشوار تھا، بلدیہ نے مزید 5 ہزار پاؤنڈ سٹرلنگ کے قرضے کی منظوری دید ی...''

دراصل یہ صرف ایک طرف سے ہی داد و دہش نہ تھی بلکہ بادشاہ بھی تجارت کے فروغ اور تاجر کے فائدہ کے لئے قوانین بناتا رہتا۔ مثلاً 1389ء میں پورے انگلستان میں اوزان اور پیائش کے یکساں پیائش پیمانوی کے رواج کا قانون پاس کیا گیا اور یہ حکم لگایا گیا کہ جو اس کی خلاف ورزی کرے گا اس کو 6 ماہ کی سزا ہوگی۔ یہی نہیں 1439 میں فرانس میں جاگیرداروں کے مظالم کے خلاف باقاعدہ ایک قانون نافذ کیا گیا، جو یوں تھا:

''یہ قانون اس لوٹ مار اور ان بے جا سختیوں اور زیادتیوں کا خاتمہ کرنے کی غرض سے نافذ کیا جا رہا ہے جو مسلح دستے برپا کرتے ہیں، یہ غارت گر دستے ایک عرصے سے غارت گردی پر زندگی گزارنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ بادشاہ فوجی سرداروں اور فوجی سپاہیوں کو بھی منع کرتا ہے کہ وہ تاجروں، مزدوروں، جانوروں، گھوڑوں اور دوسرے بار برداری کے جانوروں کو نہ پکڑیں، نہ گاڑیوں کے سامان پر قبضہ کریں

اور نہ ہی تاجروں سے ان کا سامان چھینیں۔ ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دی جائے گی۔''

ازمنہ وسطیٰ کے ابتدائی ایام میں بادشاہ کی آمدنی صرف اسی محصول پر ہوتی تھی جو خود اس کی جاگیر سے وصول ہوتا تھا۔ اس زمانے میں قومی سطح پر محاصل وصول کرنے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ لیکن 1439 میں سب سے پہلے فرانس کے بادشاہ نے قومی سطح پر محصول وصول کرنے کا طریقہ رائج کیا۔ اس سے پہلے جو روایت تھی اس کے تحت طفیلی کو زرعی اراضی عطا کی جاتی اور اس کے عوض خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ لیکن اب معاشیات زر کے رائج ہو جانے کی وجہ یہ پرانی روایت بیکار سمجھی جانے لگی اب پورے مملکت میں محصول میں روپیہ وصول کئے جانے کی رسم شروع ہو گئی۔ اور اس کے لئے باقاعدہ انفراسٹرکچر (Infrastructure) تخلیق ہونے لگا۔ یعنی محصول کو وصولی کے لئے باقاعدہ تنخواہ دار ملازم رکھے جانے کا رواج شروع ہو گیا۔ جس طرح فوج اور پولیس ضروری ہو گئی تھی اسی طرح اب روپے پیسے کی وصولی اور اس کا حساب کتاب رکھنے کے لئے ایک حد تک تربیت یافتہ عملہ کی ضرورت محسوس ہونے لگی... ان ضرورتوں اور ان کی تکمیل نے ایک مرکزی حکومت کے لئے راہ ہموار کی اور یہی ادارے دراصل قومی ریاست کی شروعات تھے۔

اس پورے عمل کے دوران یہ بھی ہوا کہ بہت سے شہروں اور دستکاروں کی تنظیموں نے اپنے حقوق کی حفاظت کے جنون میں اس مرکزیت کی خاصی مزاحمت کی۔ لیکن یہ تاجر طبقے کی اپنی خوش بختی تھی کہ وہ اس مزاحمت میں کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ تاریخ نے یہ ثابت کر دیا کہ ان مرکزی حکومتوں نے اجتماعی طور پر اس متوسط طبقے اور تاجروں اور صنعت کاروں کی معاشی ترقی کے لئے بہت سی راہیں کھول دیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا بادشاہوں کی اپنی طاقت بھی اس روپے میں پوشیدہ تھی جو وہ شہری متوسط طبقے سے وصول کرتا تھا' چنانچہ بادشاہ کی طاقت جیسے جیسے بڑھتی گئی ویسے اس کا شہر کے متوسط طبقے اور ان کے مشوروں پر انحصار بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ان بادشاہوں کے حاکمان عدالت ہوں، وزراہوں یا سرکاری اہل کار، وہ سب کے سب مالعموم اسی متوسط طبقے سے لئے جاتے تھے۔ چنانچہ پندرھویں صدی عیسوی میں فرانس کا ژاک کر (Jacques Coeur)، جو لیون کا بینکر اور اپنے زمانے کا بڑا دولت مند شخص تھا، شاہ فرانس کا مشیر مقرر ہوا۔ انگلستان کے ٹیوڈر خاندان کے زمانہ حکومت میں ٹومس کرامویل جو وکیل تھا، اور

ٹومس گریشم، جو زیشمی پارچہ جات کا تاجر تھا، ان کو شاہ انگلستان کے وزرا مقرر کیا گیا۔اس زمانے کے حالات سے متعلق ایک تجزیہ نگار لکھتا ہے:

''بادشاہ اور شہر کے صنعتی کارخانوں کے مالکوں کے درمیان معاہدہ ہوا ہے۔صنعتی کارخانوں کے مالکوں نے اپنے سیاسی اور سماجی رسوخ، اپنی ذہنی صلاحتیں اور اپنی دولت بادشاہ کی مرضی کے ماتحت کر دیئے۔بادشاہ نے اس کے بدلے میں اس کے سماجی اور اقتصادی مراعات میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔انہوں نے عام مزدور پیشہ لوگوں کو ان کی ماتحتی میں دے دیا اور ان کو (کارخانوں کے مالکوں) کی اطاعت اور فرمانبرداری کا سختی سے پابند دیا۔''

یہ وہ دور تھا جب کسان امن و امان کے ساتھ کھیتی باڑی کرنے کا آرزو مند تھا، کاریگر یکسوئی کے ساتھ اپنی صنعت کو فروغ دینا چاہتے تھے اور تاجر اپنی ترقی کے لئے امن عام کے طلب گار تھے۔ان سب جماعتوں اور طبقوں کو ایک ایسی مضبوط مرکزی قوت کی ضرورت تھی جس کے احکام تمام طبقات پر لاگو کئے جاسکیں اور جس کے قوانین تمام مقامی جماعتوں پر جو درجنوں کی تعداد میں تھیں یکساں طور پر بلا رو رعایت نافذ ہوسکیں۔ایسا مضبوط مرکز ان کی جماعت بندیوں کے درمیان ایک طرح کے اتحاد کی موجب ہوا، اس اتحاد نے قومیت کے جذبے کی آبیاری کی۔فرانس کی جون اوف ارک جس نے ان گلستان کی جارحیت کے خلاف فرانس کو متحد کیا، اس کی کشاکش زندگی اور موت بھی دراصل اسی جذبے کا مظہر تھی۔

فرانس میں جاگیرداری نظام بہت مضبوط اور مستحکم تھا لیکن صد سالہ جنگ میں، جو فرانس اور انگلستان کے درمیان ہوئی تھی، برگنڈی کے ڈیوک نے انگریزوں سے مل کر فرانس کے بادشاہ کو متعدد شکستیں دی تھیں۔جون اوف آرک جو فرانس کی محبت میں سرشار تھی، اس نے برگنڈی کے ڈیوک کو لکھا

''کنواری ژاں (جون) آرزو مند ہے کہ آپ شاہ فرانس کیساتھ ایک دیرپا صلح کر لیں۔وہ عاجزی اور خاکساری سے منت کرتی ہے کہ فرانس کی مقدس مملکت کے خلاف اب مزید فوج کشی نہ کہ جائے۔''

قومی جذبات فرانسیسی فوج کے دل و دماغ کو متاثر کر رہے تھے اور ان کے دلوں کو ایک نئے اعتماد اور یقین سے گرما رہے تھے۔اب ان کو اپنے فرانسیسی ہونے کا احساس پیدا ہو چلا تھا اور

وہ شاہ فرانس کے مفاد کو اپنا ذاتی مفاد قرار دینے لگے تھے۔ جون نے اپنی خدمات قوم پرستی کے جذبات کی آبیاری کے لئے وقف کر دیئے اور اس کے اثر سے یہ جذبات وسیع پیمانے پر عوام میں پھیلے۔ مشہور ڈرامہ نگار برنرڈ شا بھی اپنے ڈرامے ''سینٹ جون'' میں اس ابھرتی ہوئی قوم پرستی کا تذکرہ کرتا ہے۔ ایک انگریز پادری اور ایک انگریز جاگیردار آپس میں فرانس کے ایک فوجی سردار کی قابلیت پر گفتگو کرتے ہیں:

پادری: مائی لارڈ! وہ صرف ایک فرانسیسی ہی تو ہے۔

جاگیردار: ایک فرانسیسی؟ آپ نے یہ لفظ کہاں سے سنا؟ کیا یہ برگنڈی اور برٹنی کے لوگ اپنے آپ کو اسی طرح فرانسیسی کہنے لگے ہیں جس طرح ہمارے یہاں کے لوگ اپنے آپ کو انگریزی کہنے لگے ہیں؟ یہ لوگ واقعی فرانس اور انگلینڈ کا نام اس طرح لیتے ہیں گویا وہ ان کا اپنا ملک ہو۔ اپنا ملک، ذرا غور کیجیے! اگر سوچنے کا یہ طریقہ عام ہو گیا تو ہمارا اور آپ کا حشر کیا ہوگا؟

پادری: کیوں مائی لارڈ؟ کیا اس سے ہم کو نقصان پہنچے گا؟

جاگیردار: لوگ دو مالکوں کی اطاعت نہیں کریں گے۔ اگر اپنے ملک کی خدمات کرو، کا نعرہ ایک دفعہ لوگوں کے دل میں بیٹھ گیا تو ہم جاگیردار اور امرا اس کے سارے حقوق اور اختیارات ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گے۔ اور کلیسا کی بادشاہت کو بھی خدا حافظ کہہ لیجئے۔''

برنرڈ شا کے ڈرامے کا جاگیردار واقعی مستقبل کے دھندلے نشانات کا خاصی صحت کے ساتھ اندازہ لگا رہا تھا اور یہ بات بالکل درست تھی کہ قومی بادشاہت کے نشوونما اور ارتقا کی راہ میں ایک ہی اہم رکاوٹ رہ گئی تھی اور وہ رکاوٹ تھی کلیسا کی بے پایاں قوت۔ قومی بادشاہوں کو ایک ریاست میں دو حاکموں کا تصور کبھی قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ پوپ کی قوت جاگیرداروں اور امرا کی طاقت سے زیادہ خطرناک تھی۔ چنانچہ ازمنہ وسطیٰ کی ایک خصوصیت پوپ اور بادشاہوں کے درمیان نزاع کا آغاز ہوا وہ بشپ اور ایبٹ کے تقرر کے اختیار کا مسئلہ تھا۔ یہ مسئلہ دونوں قوتوں ،بادشاہ اور پوپ، کے لئے بہت اہم تھا کیونکہ کلیسا کے اندر یہ عہدے مالی اعتبار سے بہت نفع

بخش تھے۔عوام کلیسا کو محصول دیتے تھے جن کے ذریعہ کلیسا میں خاصی رقوم جمع ہو جاتیں۔اس طرح ہر گرجے کا بشپ اور ایبٹ خزانے کے ایک ڈھیر کا مالک قرار پاتا تھا۔اس خزانے کے ڈھیر سے پوپ اور بادشاہ دونوں ہی اپنے اپنے آدمیوں کو مستفید کرانا چاہتے تھے۔بادشاہ ان جگہوں کو جو دولت پیدا کرنے کا ایک اہم ذریعہ تھیں بڑی حریصانہ نگاہوں سے دیکھتا۔اس لئے یہ مسئلہ کہ ان عہدوں پر تقرری کا اختیار کسے حاصل ہو زبردست نزاعی مسئلہ بن گیا۔چرچ کی دولت کی کوئی انتہا نہ تھی۔یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ پوری زرعی اراضی کا کم از کم نصف کے قریب کلیسا کے قبضے میں تھا جس پر وہ کوئی ٹیکس ادا نہیں کرتا تھا۔اس لئے بادشاہ جس کو کاروبار حکومت کے لئے ہر وقت روپے کی اشد ضرورت رہتی تھی،اس کی مسلسل یہ کوشش رہتی کہ چرچ کی اراضی پر ٹیکس عائد کیا جائے تاکہ حکومت چلانے کے مصارف پورے کرنے میں مدد ملے۔

کلیسا اور بادشاہ کے درمیان جھگڑے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔چرچ نے بھی اپنی عدالتیں قائم کر رکھی تھیں اور کچھ خاص مقدمات باقاعدہ عدالتوں کی بجائے صرف کلیسا کی عدالتوں کے احاطہ اختیار میں سمجھے جاتے تھے اور ان عدالتوں کے اکثر فیصلے شاہی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف ہوتے تھے (یہ صورت حال آج کل پاکستان میں شریعت کورٹس کے قیام کے بعد پیدا ہوئی ہے ع۔م)اس سلسلے میں ایک اہم وجہ نزاع مجرموں سے جرمانوں کی رقوم سے متعلق تھی۔کلیسا کی عدالتیں یہ جرمانے کلیسا کے خزانے میں جمع کر لیتی تھیں۔اس کے علاوہ پوپ نے آہستہ آہستہ اپنے اثر ورسوخ کا دائرہ اختیار پھیلانا شروع کر دیا تھا اور اکثر و بیشتر وہ ملک کے اندرونی قومی مسائل میں دخل دینے لگ گیا تھا۔اس طرح چرچ نے قومی بادشاہت کے ایک طاقت ور رقیب کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

دراصل کلیسا ایک ''آسمانی قوت''تصور ہوتا تھا جس کی رعونت کا راز عام عیسائیوں کی صدیوں اندھی تقلید اور پوپ کی ''روحانی قوت'' کے خوف میں مضمر تھا۔ایک طرف وہ اور اس کا کلیسا دنیاوی سطح پر لا انداز زرعی اراضی اور بے بہا دولت کا مالک تھا،دوسری طرف اس کا روحانی دبدبہ لوگوں کو لرزہ براندام کئے رکھتا۔اس طرح مقامی چرچوں کے خزانے میں جو کچھ آتا تھا وہ روم کے خراج کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔یہ تھی وہ فضا جس نے بادشاہ کو پوپ اور کلیسا کا مخالف اور دشمن بنا دیا۔بہر حال یہ مخالفت اور دشمنی صرف بادشاہ کے طرف سے ہی نہیں تھی بلکہ خود پوپ اور اس کا کلیسا بھی بادشاہ کی مخالفت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا تھا۔پوپ بونی فیس ہشتم نے 1296 میں

لکھا:

''یہ بات کہ دنیاوی لوگ ارباب کلیسا کے بڑے مخالف ہیں، پرانے زمانے سے چلی آرہی ہے اور آجکل کے تجربوں نے بھی اس حقیقت کی پوری طرح تصدیق کرد ی ہے۔''

اس پر مستزاد یہ کہ (ہمارے پیروں اور سجادہ نشینوں کی طرح ۔ع۔م) چرچ میں اتنی آلائشیں در آئی تھیں کہ اب وہ عوام سے چھپی ڈھکی نہیں رہی تھیں۔ سب سے بڑی چیز جس نے لوگوں کو کلیسا سے بہت بد دل کر دیا تھا وہ اہل کلیسا کی منافقت تھی۔ راہب اور پادری جو باتیں اپنے وعظوں میں کہتے اس پر خود کبھی عمل نہیں کرتے تھے۔ قول و فعل کا یہ واضح اختلاف ایسا نہ تھا جسے بیوقوف لوگ بھی محسوس نہ کر لیتے ہوں۔ جائز و ناجائز طور پر دولت کو بٹورنا ان کی روزمرہ زندگی کا عام معمولی بن گیا تھا۔ چنانچہ خود اینیس سلوئس، جو آگے چل کر پوپ پیش دو ئم (Aeneas Silvius-Pius II) کے نام سے جانا پہچانا گیا، اسکا یہ قول ایک زمانے میں اچھا خاصا زبان زد عام ہو گیا تھا کہ ''روم میں روپیہ خرچ کئے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا''

اسی طرح پیر پر شوا (Pierre Berchoia) جو انگریزی شاعری چوسر (chaucer) کے دور کا آدمی تھا، لکھتا ہے۔ ''کلیسا کی دولت غریبوں کے کام نہیں آتی بلکہ صرف ارباب کلیسا کے بھائی بھتیجے اس سے پالے جاتے ہیں۔''

کلیسا کے ہتھ کنڈوں کے بارے میں یورپی ادب میں اچھا خاصا مواد ہے۔ یہاں ہم چودھویں صدی کے ایک شاعر کی ایک طویل نظم کے کچھ حصے نثر میں درج کرتے ہیں جن سے کلیسا اور اس کے اہل کاروں، پادریوں، بشپ اور خود پوپ کے بارے عوام کے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے:

''میں دیکھتا ہوں پوپ امانت میں خیانت کرتا ہے
یہ ہمیشہ دولت سمیٹتا رہتا ہے
لیکن غریب اس کی نگاہ کرم کے مستحق نہیں ٹھہرتے
یہ ہر طرح سے دولت گھسٹینا چاہتا ہے
عیسیٰ کے پیروؤں کو زبردستی اپنی اندھی تقلید پر مجبور کرتا ہے
تا کہ وہ خود سنہرے ملبوس میں آرام سے زندگی گزار سکے۔

پوپ کا نائب کارڈنل بھی اس سے کم نہیں
وہ صبح صادق سے شام کی تاریخی تک
اپنا وقت ان منصوبوں پر صرف کرتا ہے
کہ جس طرح بن پڑے جائز اور ناجائز ہر شخص کو لوٹ لے۔
ہمارے بشپ بھی اسی طرح کے گناہوں سے لتھڑے ہوئے ہیں
وہ بڑی بے رحمی سے کھال کھینچتے ہیں
تا کہ مرغن غذائیں اڑائیں۔
تم اپنے سونے سے ان کی سرکاری اور مقدس مہر خرید سکتے ہو،
کسی فرمان کیلئے اس سے بحث نہیں کہ اس میں کیا ہوگا
خدا ہی ہے جو انہیں چوری سے روک سکتا ہے
جہاں تک تمام پادریوں اور چرچ کے چھوٹے عہدے داروں کا تعلق ہے
خدا ہی بہتر جانتا ہے ان میں بہت ایسے ہیں
جن کی روزمرہ زندگی کو ان کے روزمرہ کے اعمال جھٹلاتے ہیں۔
وہ چاہے جاہل ہوں یا عالم
وہ ہر مقدس نشانی کو بیچ کھانے کا عہدہ کر چکے ہیں
عوام کی مقدس قربانیاں بھی ان کا مال تجارت ہیں۔
چھوٹے اور بڑے پادری نمائش کرتے ہیں۔
ان سخت اور خشک قوانین پر عمل کرنے کی۔
لیکن یہ ان کی بیکار ریاکاری ہے۔
ہم جانتے ہیں وہ جس طرح رہتے ہیں
وہ جو کچھ گھر پر کرتے ہیں، اپنے عہد و پیمان کے باوجود!
ان کی پرہیزگاری کی ساری نمائش بیکار ہے۔

عسائیت اور کلیسا میں در آنے والی خرابیوں کے شعور نے عیسایت کی اصلاح کی تحریکوں کو جنم دیا۔ان تحریکوں کے اولین رہنماؤں میں چودھویں صدی کے دو مصلحین وائی کلف (wycliff) جس کا تعلق انگلستان سے تھا، اور ہس (huss) جس کا تعلق جرمنی سے تھا، خاص

طور پر قابل ذکر ہیں۔انہوں نے اپنے تجدید واصلاح کی تحریکیں مذہبی امور تک محدود نہیں رکھیں بلکہ سماجی تبدیلیوں کی بھی کوشش کی۔وائی کلف نے انگلستان میں کسانوں کے روحانی لیڈر کی حیثیت اختیار کر لی تھی،اور اسی طرح جرمنی کے علاقے بوہیمیا میں ہس نے صرف پاپائے روم ہی کے خلاف بغاوت کی تبلیغ نہیں کی اس نے کسانوں کی ایک حد تک کمیونسٹ تحریک شروع کر دی تھی۔اس کی تعلقات نے مروجہ رومن کیتھولک افکار کو تو جھنجھوڑا ہی لیکن ساتھ ہی ساتھ امرا اور جاگیردار بھی ان خیالات سے اپنے حقوق واختیارات کے لئے زبردست خطرہ محسوس کرنے لگے۔نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسا کے علاوہ دنیاوی طاقتیں بھی ہس اور اس کے پیروکاروں کے خلاف میدان میں اتر آئیں اور ان کو کچل کر رکھ دیا۔یہی حشر انگلستان میں وائی کلف کے ماننے والوں کا ہوا۔

ہس کی تحریک کی ناکامی نے عیسایت میں اصلاح کرنے والے عناصر کو ایک سبق واضح طور پر سکھا دیا،کہ مذہبی اصلاح اور سماجی اصلاح کا کام ایک ہی وقت میں شروع نہیں کیا جا سکتا۔گو یہ درست ہے کہ کلیسا اور جاگیرداروں کے درمیان اپنے تنازعات تھے،لیکن جیسے ہی کوئی مصلح دونوں کے خلاف تحریک شروع کرنے کا بیڑہ اٹھایا تو پوپ اور جاگیردار اس کے خلاف صف آرائی کر لیتے۔

ہس اور وائی کلف کے بعد یورپ میں سولہویں صدی میں جو مصلح پیدا ہوئے انہوں نے یہ غلطی نہیں کی۔ان مصلحین میں سب سے بڑا نام مارٹن لوتھر (Martin Luther) کا ہے جس نے رومن کیتھولک چرچ کے خلاف 1517 میں وٹن برگ چرچ کے دروازے پر اپنے ''پچانوے اقوال'' چسپاں کر کے یورپ میں ریفرمیشن تحریک کا آغاز کیا اور پروٹسٹنٹ فرقے کی بنیاد ڈالی۔لوتھر کے علاوہ دوسرے بڑے مصلحین کالون (calvin) اور نوکس (knox) تھے۔اول الذکر کا تعلق سوئزرلینڈ سے تھا،موخر الذکر کا سکاٹ لینڈ سے۔

ان مصلحین نے سماجی تبدیلی اور مساوات پر مبنی کسی ایسی تحریک کی داغ بیل نہیں ڈالی جس سے حاکم طبقے کے حقوق کو دھکا لگتا۔لوتھر انتہا پسند نہ تھا اس نے پسماندہ اور مظلوم طبقوں کا ساتھ دے کر اپنی کامیابی کے امکانات ختم نہیں کئے بلکہ اس نے جرمنی کے کسانوں کی بغاوت میں بھی اس کے تعلیمات سے متاثر ہو کر شروع کی گئی تھی کسانوں کے بجائے حاکم طبقے کا ساتھ دیا۔کلیسا کا یہ باغی کہا کرتا تھا:

''میں ہمیشہ ان کا ساتھ دوں گا جو بغاوت کو برا کہیں گے اور ان کے خلاف رہوں گا جو بغاوت کو جنم دیتے ہیں''۔

لوتھر، جو کلیسا کی ہیبت حاکمانہ کا شدید مخالف تھا، لکھتا ہے:

''خدا حکومت کو خواہ وہ کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو باقی رکھے گا لیکن ان باغیوں کو امان نہ دے گا جو حکومت کی مخالفت کریں گے، خواہ وہ کسی منصفانہ مقصد کیلئے ہی کیوں نہ ہو۔''

1525 میں جرمنی کے اندر کسان بغاوتیں خاصی زوروں پر تھیں اور جرمن کسان چلا رہا تھا کہ حضرت مسیح نے ''عام انسانوں کو آزاد کیا ہے۔'' لیکن لوتھر ان باغی کسانوں کو کچلنے کے لئے امرا اور جاگیرداروں کو بہت پرزور الفاظ میں اکسا رہا تھا اور ببانگ دہل کہہ رہا تھا:

''جو بلوائی کو قتل کرتا ہے وہ صحیح کام کرتا ہے اس لئے جس سے ہو سکے وہ (ان باغیوں کو) قتل کرے، ان کا گلا گھونٹے یا ان کے چھرا گھونپے، پرسرعام یا چوری چھپے اگر تم اس مقابلے میں کام آجاؤ تو تم قابل مبارک باد ہو، اس موت سے زیادہ اعلیٰ موت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔''

بعض تجزیہ نگاروں کے خیال میں لوتھر کی کامیابی دراصل وجہ ہی یہ تھی کہ اس نے ان طبقوں کو جو صاحب اختیار اور طاقتور تھے چھیڑنے کا ارادہ نہیں کیا۔ لوتھر کی تجدید و اصلاح کی تحریک کی کامیابی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ لوتھر، کالون اور نوکس جیسے مصلحوں نے لوگوں کے قوم پرستانہ جذبات کو ایسے وقت ابھارا جب قوم پرستی اپنے شباب کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ ان مصلحین کی تحریکوں نے اس وقت اپنے پرچم کھولے جب فضا ان کے لئے تیار تھی اور پاپائیروم کے اقتدار اعلیٰ کے خلاف قومی جذبات ابھارنے کا یہ بالکل صحیح وقت معلوم ہو رہا تھا۔ لوتھر کی پوپ کی مذہبی مخالفت نے ایک عام قومی تحریک سے ہم آہنگ ہو کر اپنی کامیابی کے لئے راستہ ہموار کر لیا۔ اس نے جرمن امرا کے نام اپنے ایک خط میں لکھا:

''چونکہ خدا نے دنیاوی حکومت بدوں کو سزا اور نیکوں کی حفاظت کے لئے قائم کی ہے اس لئے ہمیں چاہئے کہ ہم اس کو پوری مسیحی دنیا میں اپنے فرائض انجام دینے دیں، اس کا خیال کئے بغیر کہ اس کی زد میں پوپ آتا ہے یا بشپ، پریسٹ کانن۔''

اس دور میں قومی ریاستوں کے لئے اصل مسئلہ ہی اپنی خودمختاری اور بلا روک ٹوک اپنے

اقتدار اعلیٰ کو منوانا تھا۔ان کو کسی بھی حالت میں کسی بیرونی مداخلت ،خواہ وہ مذہب کے نام پر پاپائے روم ہی کی کیوں نہ ہو،قطعاً گوارا نہ تھی ،اور وہ یہ بھی خواہاں تھے کہ کلیساؤں کے تمام خزانے اوران کی زرعی اراضی جو بلا ٹیکس اور بلا شکت غیرے کلیسا کی ملکیت میں ہے ان کے تصرف سے نکل کر ریاست اور بادشاہ کے تصرف میں آجائے۔امرا اور بادشاہ کے اسی جذبے کی تشفی کے لئے لوتھر نے لکھا:

''بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہر سال تین لاکھ گلڈرز (جرمن سکے guiders) جرمنی سے روم بھیجے جاتے تھے لیکن اس کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا ۔پرانے زمانے میں جرمن شہنشاہوں اور شاہزادوں نے پاپائے اعظم کا یہ حق تسلیم کرلیا تھا کہ وہ جرمن اوقاف کی پہلے سال کی نصف آمدنی لے لیا کریں لیکن چونکہ ان رحمتوں کا بہت بے جا استعمال ہورہا ہے اور وہ بہت بے شرمی سے خرچ کی جارہی ہیں اس لئے جرمن امرا اور شاہزادوں کو اب اس طرح اپنی زمینوں اور آدمیوں کا استحصال نہیں کروانا چاہئے اور انہیں بربادی سے بچانا چاہئے۔کسی شاہی حکم یا قومی قانون کے ذریعے سے اوقاف کی آمدنی ملک کے اندر رکھی جائے اور اس کا بیرون ملک جانا ہمیشہ کے لئے ختم کیا جائے۔''

''عوام کی ایک جماعت وسمجھاؤ کہ یہ تمہارا حق ہی نہیں بلکہ تمہارا فرض بھی ہے کہ طاقتور غیر ملکیوں سے جو تمہارے ملک کے اندر رہ کر تمہارے حقوق واختیار پر قبضہ کررہے ہیں،نجات حاصل کرو،لوگوں کی نگاہوں کے سامنے اغیار کی اس دولت کی تصویر کھینچو اور انہیں یقین دلاؤ کہ اگر تم نے ان کو نکال باہر کیا تو دولت کے یہ سارے انبار تمھارے ہوجائیں گے۔پھر دیکھو تمھاری تحریک کس قدر جلد آگ کی طرح پھیلتی ہے اور اس کے شعلے کتنی کم مدت میں چاروں طرف پھیل جاتے ہیں۔''

یورپ میں اس وقت کی جو فضا تھی اس میں اگر تجدید اور صلاح دین کی تحریکیں شروع نہ بھی ہوئی ہوتیں تب بھی کلیسا اپنے اقتدار کو زیادہ ذیر تک قائم نہ رکھ سکتا کیونکہ کلیسا کی افادیت اپنا دور اور وقت پورا کرچکی تھی۔اب اس کی ضرورت دن بدن کم ہوتی جارہی تھی۔پرانے زمانے میں جب کلیسا نے یورپ کی دکھی انسانیت کو سکون پہنچا کر ان کے دل جیتے تھے تو اس وقت چاروں طرف امرا اور جاگیردار ایک دوسرے سے تلوار بدست متصادم تھے اور عوام کا جان و مال ہر وقت

خطرے میں رہتا تھا۔اس وقت کلیسا نے امن عامہ کا پیغام دے کرعوام وخواص کے دل جیت لئے تھے ۔اب کلیسا کے اقتدار اعلیٰ کی جگہ بادشاہ اتنا صاحب اختیار ہو چکا تا کہ امرا اور جاگیرداروں کی آپس کی خانہ جنگیوں کی قابو میں لا سکے۔ پرانے زمانے میں کلیسا ہی تعلیم کا ذمہ دار ہوتا تھا،اب تاجروں نے آزاد سکول قائم کر لئے تھے جن کا کلیسا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ پہلے کلیسا کے قوانین کو تمام دوسرے قوانین پر بالا دستی حاصل تھی ،اب ان کی جگہ رومن لا لوگوں کے عدل وانصاف کی ضرورتوں کو بطریق احسن پوری کر رہا تھا، پرانے زمانے میں صرف چرچ ہی حکومت کے کام چلانے کے لئے پڑھے لکھے لوگ مہیا کرتا تھا،اب بادشاہ نے ایک نئی جماعت پر بھروسہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ جماعت تجارتی کاروبار سے پوری طرح واقف تھی اور لوگوں کے صنعتی رجحانات کو بھی خوب سمجھتی تھی۔

اس نئی جماعت ،یعنی ابھرتے ہوئے متوسط طبقے ، نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا اس کی مزید ترقی کی راہ میں قدیم فرسودہ جاگیرداری نظام حارج ہے اور کلیسا قدیم جاگیرداری نظام کا مضبوط قلعہ ہے،اس لئے جاگیرداری نظام کے خاتمہ کیلئے اس کلیسائی قلعہ کو ڈھانا ضروری ہے ۔چنانچہ اس وقت ایسا ہی ہوا۔اس کشاکش نے مذہبی لبادہ پہن رکھا تھا،اور یہ وقت کا تقاضا بھی تھا۔مذہب کی یہ نئی تحریک ''پروٹسٹنٹ ریفرمیشن'' کے نام سے موسوم ہوئی درحقیقت یہ وہ پہلی نتیجہ خیز لڑائی تھی جس نے ایک طرف پاپائے روم کے اقتدار اعلیٰ کو ختم کیا اور دوسری طرف ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کو فرسودہ جاگیرداری نظام پر حاوی کیا۔

''امیر لوگ.....''

قرون وسطیٰ میں جب اشیاء کے تبادلے کے ذریعے تجارت کا رواج ختم ہوا اور اس کی جگہ سکے نے لے لی تو تجارت کی توسیع کے لئے چاندی کی ضرورت میں اضافہ ہو گیا۔ چونکہ سکوں میں سونا اور چاندی استعمال ہوتا تھا اس لئے اس دور کی ایک اہم ضرورت ان دھاتوں کی تلاش تھی۔ چنانچہ قرون وسطیٰ کے درمیانی دور میں جب یورپ کے ملاحوں نے بحری قزاقی کا دھندا شروع کیا تو اس کا اصل مقصد سونا چاندی حاصل کرنا ہی تھا۔ کولمبس کی مہم جوئی کے پیچھے بھی یہی مقدس کام کر رہا تھا۔ جب وہ ہندوستان نہیں پہنچ سکا جو اس کی مبینہ منزل تھی تو ایک عالم نے اس کی مہم کو ناکام گردانا، لیکن جب سولہویں صدی میں میکسیکو اور پیرو کی کانوں سے چاندی سپین پہنچنا شروع ہوئی تو اس کی مہم کی اہمیت کا احساس ہونا شروع ہوا۔ بہر حال یورپی تاجروں کے لئے ہندستان وہ جگہ تھی جہاں سے مسالے، جواہرات، دوائیاں، عطر اور ریشمی کپڑے یورپ لائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ دور کے سارے مشرقی ملکوں کا سامان یہاں کی بندرگاہوں اور تجارتی مراکز میں پہنچتا تھا اور پھر یہاں سے یورپ کے بازاروں کے لئے خریدا جاتا تھا۔ یہ تجارت نہایت نفع بخش تھی کیونکہ یورپ کے نئے مالدار طبقوں کو ان لگژری گڈز کا بہت شوق تھا اور وہ ان کیلئے بڑی بڑی قیمتیں دینے کیلئے تیار تھے۔ لیکن روایتی طور پر یہ تجارتی آمد و رفت جس طرح ہوتی تھی وہ نہایت کٹھن اور مدت طلب سلسلہ تھا۔ ہزاروں میلوں کا سفر دشوار گزار سفر پہاڑوں، ریگستانوں پر کیا جاتا تھا جس میں کبھی اونٹوں پر سامان لادا جاتا تھا اور کبھی گھوڑوں پر، کبھی خچروں پر، اور کبھی کبھی تو انسانوں کی کمروں پر بھی باندھا جاتا تھا۔ اور سب بڑی مشکل یہ تھی کہ آخر میں یہ اٹلی کے شہر وینس پہنچتا تھا جہاں کے سوداگر اس کو خرید کر اس پر اپنی اجارہ داری قائم کر لیتے تھے اور پھر بہت مہنگے داموں پر یورپ کے دوسروں سوداگروں کو فروخت کرتے تھے۔ یہ

وجہ تھی کہ یورپی سوداگر اپنے اپنے ملکوں کے بادشاہوں کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ ہندوستان تک پہنچنے کے بحری راستے تلاش کریں۔

یہ راستہ واسکوڈی گاما نے تلاش کر لیا جو افریکہ کی جنوبی نوک کیپ اوف گڈ ہوپ سے گزرتا ہوا ہندوستان کے ساحلی شہر کو پہنچا۔ اس کے بعد یورپ کی مشرقی تجارت چھلانگوں کے حساب سے بڑھنے لگی ور سمندر شاہراہ بن گئے جن پر دن رات سینکڑوں جہاز آنے جانے لگے، اور جہاں پہلے کچھ جرمن شہر اور وینس ہی تجارتی مراکز ہوا کرتے تھے وہاں اب پرتگال، سپین، ہالینڈ، انگلستان اور فرانس سب ملک تجارت کے مرکز بن گئے۔ پہلے تجارت صرف یورپ اور ایشیا کے درمیان ہوتی تھی۔ اب امریکہ اور افریقہ کے براعظم اس کا حصہ بن گئے۔ یہ ایک زبردست کمرشل انقلاب تھا۔ ایک چیز سے دوسری چیز نکلی۔ تجارت کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں سے سائنسی دریافتوں کو شہ ملی، ایکسپلوریشن کی ہمت افزائی ہوئی، اور ان سب چیزوں نے مل کر تجارت کو مزید وسعت دی اور یورپ کی دولت میں، عیش وعشرت میں، آرٹ اور ادب میں ترقی ہوئی۔ لوگوں میں خود اعتمادی آئی، ان کے حوصلے بڑھے۔ خود تاجروں نے نئے نئے مارکیٹ ڈھونڈنے کیلئے مہم جوؤں کی ہمت افزائی۔ مثال کے طور پر ایک کمپنی خاص طور اسی کام کیلئے قائم کی گئی جس کے اعراض ومقاصد میں مندرجہ ذیل شامل تھا۔

''حوصلہ مند تاجروں کی جماعت ان ملکوں، سلطنتوں، جزیروں اور مقامات کی تلاش کے لئے قائم کی جاری رہی ہے جن تک تاجروں کی ابھی رسائی نہیں ہوئی ہے۔''

تجارت اب جس منزل میں داخل ہو رہی تھی وہ قطعی طور پر نئی تھی۔ اب تاجروں کو دور دراز ملکوں کے لوگوں سے سابقہ پڑ رہا تھا جن سے وہ واقف نہیں تھے، نہ وہ ان ملکوں کے حالات سے واقف تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ روپیہ پیسہ کا لین دین اب پہلے سے کہیں بڑے پیمانے پر ہو رہا تھا اور دنیا کے چار براعظموں کے درمیان آمدورفت کے لئے بھی بڑے بڑے جہازوں اور بڑے عملے کی ضرورت تھی۔ دوسرے الفاظ میں یورپ کے تاجروں کو انوسٹمنٹ کے لئے اتنے بڑے پیمانے پر سرمایہ ایک نئے پیمانے کے ساہوکاری سرمایہ داری ادارے کی بنیاد پڑی جسے جوائنٹ سٹوک کمپنی کہتے ہیں۔ اس قسم کی کمپنی کا طریقہ کار یہ تھا کہ کمپنی کے حصص کو عام پبلک میں فروخت کیا جاتا تھا۔ جس کے پاس جتنے حصص ہوتے اس کا کمپنی کے نفع، نقصان میں اتنا ہی حصہ ہوتا۔

MashalBooks.com

انگلستان میں پہلی جوائنٹ سٹوک کمپنی ''مرچنٹ ایڈونچررز'' کے نام سے قائم ہوئی۔اس کے 420 شیئر ہولڈرز تھے جنہوں نے 25 پونڈ فی کس سرمایہ لگایا۔کل ملا کر یہ سرمایہ کافی بڑی رقم تھا ۔یہ جوائنٹ سٹوک کمپنیاں ہی ہماری آجکل کی بڑی کارپوریشنز کی پیشرو تھیں۔جوائنٹ سٹوک کمپنیاں اتنی مقبول ہوئیں کہ بحری قزاقوں کی مہموں کے لئے بھی اسی طرح سرمایہ فراہم کیا جانے لگا (کیونکہ بالاخر یہ بھی تو اس زمانے میں ایک ''بزنس'' تھیں!) لطف کی بات یہ ہے کہ جب مشہور بحری مہم جوڈریک (Drake) کی سرکردگی میں سپین کے جہازوں کے خلاف مہم منظم کی گئی تو اس کے لئے جو کمپنی قائم کی گئی اس میں خود انگلستان کی اس وقت کی حکمراں ملکہ الزبتھ نے بھی حصص خریدے۔اس مہم میں انگلستان کی اس کمپنی کو چار ہزار سات سو فیصد نفع ہوا اور ملکہ الزبتھ کو اس منافع سے دو لاکھ پچاس ہزار پاؤنڈ!

اس غارت گرانہ مہم میں ملکہ کی شراکت کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن یہ بات کوئی زیادہ دیر چھپی نہ رہ سکی۔سپین میں فوگر (Fugger) کمپنی نیوز لیٹر 7 دسمبر 1569 کو شائع ہوا جس میں لکھا تھا:

> ''اس معاملہ کا جو بہت ناگوار پہلو ہے وہ یہ ہے کہ یہ ہوکنز (جوڈریک کا ساتھی تھا) ملکہ کی مدد اور خفیہ منظوری کے بغیر نہ اتنے بڑے بیڑے کا ساز و سامان مہیا کر سکتا تھا اور نہ اتنے آدمیوں کا انتظام اس کے بس کی بات تھی۔ملکہ کا یہ رویہ اس معاہدے کے خلاف ہے جس کے واسطے بادشاہ نے ایک غیر معمولی سفیر انگلستان بھیجا تھا۔اعتبار قائم نہ رکھنا (انگریز) قوم کی فطرت اور عادت ہے۔ملکہ حیلہ تراشتی ہے کہ جو کچھ ہوا اس کی لاعلمی میں ہوا اور اس کی منظوری کے بغیر کیا گیا۔''

یہ فوگر مشہور یہودی مہاجن خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اس خاندان کا کاروبار پورے یورپ میں پھیلا ہوا تھا۔یہ حکومتوں اور بادشاہوں کو بھی قرضہ دیتا اور جب یورپ میں سولہویں اور سترھویں صدی میں جوائنٹ سٹوک کمپنیاں قائم ہوئیں تو ان میں بھی اس مہاجن خاندان کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ان کمپنیوں میں سے سات کمپنیاں تو ایسٹ انڈیا'' کمپنیوں کے نام سے کی تھیں۔یہ انگلستان ہولینڈ،فرانس،سویڈن اور ڈنمارک میں قائم ہوئیں۔لیوانت اور افریقی کمپنیاں بھی بہت مشہور تھیں۔دلچسپ بات یہ ہے پہلی امریکی ''ورجینیا'' کمپنی بھی لندن ہی میں قائم ہوئی۔

یہ کمپنیاں جو بڑے بڑے سرمایوں سے اتنے خطرناک مہموں کے آغاز کے لئے وجود

میں آئی تھیں دراصل امن کو اپنی اپنی حکومتوں کی مکمل تائید اور آشیر باد حاصل تھی۔ اسی لئے وہ اپنی حکومتوں سے زیادہ تجارتی حقوق ہی نہیں بلکہ اجارہ داری بھی حاصل کر لیتی تھیں اور اس اجارہ داری کی بدولت یہ دوسری تجارتی کمپنیوں اور تاجروں کو مقابلے سے روک دینے میں کامیاب ہو جاتیں ان کمپنیوں کی تجارت کے بارے میں حقیقت جو بھی ہو ایک بات واضح تھی کہ وہ اپنے حصہ داروں کے لئے منافع کمانے کے لئے ہر قسم کے ہتھیار اور فریب استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتی تھیں۔

تجارت کی توسیع کے ساتھ ساہوکار اس قرون وسطیٰ میں جتنے پھلے پھولے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ تاریخ کی کتابوں بادشاہوں کی اولوالعزمی ان کی فتوحات اور جنگوں کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کرتی ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ حد تک وہ اپنا زور بیان غلط لوگوں کے لئے صرف کرتی ہیں۔ اصل طاقت اور قوت تو وہ عناصر تھے جو ان بادشاہوں کو اپنے سرمائے کے سہارے قائم رکھتے ہوئے تھے۔ یہ بادشاہ کوئی بھی جنگ نہ لڑ سکتے اگر مہاجن (جن کو آجکل کی اصلاح میں ہم فائنانسیرز اور بنکرز کہتے ہیں) اپنا سرمایہ ان کو فراہم نہ کرتے۔

اس سلسلے میں مقدس رومن امپائر کے حصول کی داستان خاصی دلچسپ ہے۔ سپین کا بادشاہ چارلس پنجم اور فرانس کا حکمران فرانس اول دونوں رومن امپائر کے مقدس تاج کے آرزمند تھے۔ لیکن اس نزاع کا فیصلہ ان کے بس میں نہیں تھا۔ جرمنی کے ایک چھوٹے مہاجن جیکب فوگر نے (Jacob Fugger) جو مشہور مہاجنی خاندان کا سردار تھا، یہ جھگڑا طے کرا دیا۔ سپین کے فرمانروا چارلیس کو اس تاج کے لئے آٹھ لاکھ پچاس ہزار سونے کے سکے فلورن ادا کرنے پڑے جس خطیر رقم میں پانچ لاکھ سینتالیس ہزار سکے جیکب فوگر نے بطور قرض دیئے تھے۔ جب بادشاہ نے اس قرض کی ادائیگی میں تاخیر کی تو فوگر نے جو تقاضے کا خط سپین کے فرمانروا کو لکھا اس سے اس کے اثر و رسوخ اور رعب داب کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> ''... ہم نے جناب والا کے نمائندوں کو ایک بڑی خطیر رقم دی تھی۔ اس رقم کا بڑا حصہ خود ہم نے اپنے دوستوں سے بطور قرض لیا تھا۔ یہ سب کو علم ہے کہ عالیجاہ رومن امپائر کا تاج کبھی حاصل نہ کر سکتے اگر میری بروقت امداد آپ کے کام نہ آتی۔ میں یہ بات آپ کے نمائندے کی تحریروں سے جو انہوں نے اپنے دستخطوں سے مجھے دی ہیں ثابت کر سکتا ہوں۔ میں نے اس معاملہ میں اپنے ذاتی نفع کا کوئی خیال نہیں

کیا۔اگر میں آسٹریا کے شاہی خاندان کا ساتھ چھوڑ دیتا اور فرانس کے مفاد کو آگے بڑھاتا تو میں بہت روپیہ اور بڑی جائیداد حاصل کر لیتا، جیسا کہ اس وقت مجھ سے وعدہ کیا جا رہا تھا۔اگر میں ایسا کرتا تو جناب والا کو اور آسٹریا کے شاہی خاندان کو کتنا نقصان پہنچتا، اس بات سے عالیجاہ خوب واقف ہیں۔''

اس مکتوب سے اس دور کے مہاجن خاندانوں کے رعب اور دبدبے کا اندازہ ہو جاتا ہے اور ان کی دولت اور کاروبار کے پھیلاؤ کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ایسے مہاجن خاندان درجنوں کے حساب سے یورپ میں پھیلے ہوئے تھے۔انہی مہاجنوں اور تاجروں نے مل کر سولہویں صدی میں بنکوں کی بنیاد رکھی اور ہنڈیوں (Bill of Exchange) کے استعمال کا رواج ڈالا۔

تجارت کی اس زبردست ترقی نئے نئے ملکوں سے دولت کمانے کے مواقع، سوداگروں اور بنکروں کے خزانوں میں دولت کی ریل پیل، ان سب باتوں سے شاید آپ کو یہ گمان ہو کہ یورپ میں انسان کیلئے خوشحالی اور مسرت کا ایک زریں دور شروع ہو گیا ہو گا۔لیکن یہ آپ کی غلطی ہو گی۔مہاجنوں کا یہ دور بھکاریوں کا دور بھی تھا، جیسا آپ کو ہم اگلے باب میں بتائیں گے۔

MashalBooks.com

’’... غریب لوگ، فقیر لوگ، اور چور!‘‘

سولہویں اور سترھویں صدیوں میں جب مہاجنوں کے محلوں پر سونے چاندی کی بارش ہو رہی تھی تو اس وقت بھکاریوں کی بے تحاشہ تعداد یورپ کے بہت سے شہروں میں در در کی ٹھوکریں کھا رہی تھی۔ 1630 عیسوی میں پیرس کی چوتھائی آبادی بھکاریوں پر مشتمل تھی، اور فرانس کے دیہاتی علاقوں میں قریب قریب نصف آبادی فاقہ کشی سے دوچار تھی۔ انگلستان اور ہو لینڈ میں زندگی کا نقشہ فرانس سے مختلف نہ تھا، اور سوئزرلینڈ کی صورت حال کا تذکرہ ایک دستاویز میں یوں درج ہے:

’’جب ان بھکاریوں سے جو امرا کے گھروں کو گھیرے رہتے تھے اور گروہ در گروہ سڑکوں اور جنگلوں میں گھومتے رہتے تھے نجات پانے کی کوئی شکل نہ رہی تو امرا نے با قاعدہ شکاری دستے ترتیب دینے شروع کر دیئے جن کا کام ان بھکاریوں کا شکار کرنا ہوتا تھا۔

ان امراء کی کچھ مشکل اس زمانے کی جنگوں نے آسان کر دی۔ چنانچہ جرمنی کی تیس سالہ جنگ جو 1618 سے 1648 تک جاری رہی اس میں یورپ کی دو تہائی آبادی کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔ جو باقی بچی ان کی تباہ حالی دیکھی نہیں جاتی ، دیہاتوں کا 5/6 حصہ برباد ہو گیا تھا۔ ہم نے پلیٹینیٹ (Palatinate) کے بارے میں پڑھا ہے کہ وہ دو سال میں اٹھائیس مرتبہ لوٹا گیا۔ اسی طرح سیکسنی (saxony) میں بھیڑیوں کے جھنڈ گشت کرتے اور مردوں کا گوشت کھاتے تھے

کیونکہ شمال علاقوں کی ایک تہائی زرعی اراضی پر کاشت کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔

جس زمانے میں انگلستان، ہولینڈ اور فرانس تجارت کے ذریعے دولت کے انبار لگا رہے تھے تو ہسپانیہ اس زمانے میں ایک اور ہی سادے طریقے سے اپنے خزانے بھر رہا تھا۔ اس کے جہاز ران ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرنے میں تو ناکام رہے تھے لیکن وہ شمالی اور جنوبی امریکہ کے براعظموں پر اتفاقاً پہنچے اور وہاں اپنا تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ جنوبی امریکی براعظم کے ممالک میکسیکو اور پیرو میں سونے کی بے شمار کانیں موجود تھیں۔ ہسپانوی جہازوں نے دھڑا دھڑ یہ قیمتی دھاتیں ہسپانیہ پہنچانی شروع کر دیں۔ 1545 عیسوی سے 1560 عیسوی تک کے 15 سالوں میں ہسپانیہ ان کانوں سے بیس لاکھ سالانہ چاندی نکالتا رہا۔ ابتدا میں 1500 عیسوی سے لے کر 1520 تک کے عرصہ میں ہسپانوی ٹکسالوں نے تقریباً 45 ہزار کلوگرام چاندی ڈھالی تھی لیکن 1545 سے 1560 تک ہسپانوی ٹکسالوں میں ڈھالی جانے والی چاندی کی مقدار 6 گناہ بڑھ گئی اور دو لاکھ ستر ہزار کلوگرام ہو گئی۔ پھر 580 سے 1600 تک یعنی محض بیس سال کے عرصے میں، یہی مقدار 3 لاکھ 40 ہزار کلوگرام تک پہنچ گئی!

دولت کا یہ سیلاب جو میکسیکو اور پیرو کی کانوں سے بہ کر سپین میں آ رہا تھا، کہاں جاتا تھا؟ کیا یہ سپین میں ہی رک جاتا تھا؟ نہیں بالکل نہیں، یہ سپین میں آتے ہی یورے یورپ میں پھیل جاتا تھا۔ اس دولت کی فراوانی نے سپین کے بادشاہوں کو اپنی مملکت کی توسیع کے لئے بے تاب کر دیا اور انہوں نے پے در پے احمقانہ لڑائیوں میں اپنے کو ملوث کر کے اپنی دولت کو ایک طرف رسد اور فوجوں کی تنخواہوں پر صرف کیا تو دوسری طرف (کیونکہ ہسپانوی عوام چاندی کھا تو نہیں سکتے تھے) انہوں نے اسے اپنے لئے عیش و عشرت کا سامان حاصل کرنے کیلئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ وہ اپنا سامان تو کم بیچتے تھے لیکن دوسرے کا سامان زیادہ مقدار میں خریدتے تھے۔ اس طرح ہسپانیہ کی یہ دولت اجنبی بدیسی تاجروں کے ہاں پہنچنی شروع ہوئی اور اس نے پور یورپ کی معاشیات کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا۔ چاندی کے آنے سے چیزوں کی قیمتوں میں بلا کا اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ 1600 عیسوی میں پورے یورپ میں چیزوں کی قیمتیں دوگنی ہو گئیں اور ایک صدی بعد تین گنا اضافہ ہو گیا۔

قیمتوں کے اضافے کی بھی اپنی ایک سائنس ہے۔ جس طرح سکے کی قیمت کم کرنے سے چیزوں کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں اسی صورت میں جب روپے کی بڑی تعداد بازار میں آ جاتی ہے تو

چیزوں کی قیمتوں میں زبردست اضافہ شروع ہوجاتا ہے۔جیسا کہ آپ کو معلوم ہے روپیہ بھی ایک ایسی چیز ہے جس کی انسانوں کو ضرورت رہتی ہے،لیکن اس کی سپلائی اتنی نہیں جتنی اس کی مانگ ہوتی ہے۔اس لئے روپیہ اتنی قیمتی چیز ہے۔اس کا مقابلہ ہوا سے کیجئے۔ہوا کی ہم سب کو ضرورت ہوتی ہے لیکن ہوا اتنی مقدار میں ہر جگہ موجود ملتی ہے کہ اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ۔لیکن صاف پانی کمیاب ہے اس لئے اس کو حاصل کرنے کے لئے اسے خریدنا پڑتا ہے یا اس کی قیمت ٹیکس کی صورت میں ادا کرنا پڑتی ہے۔

یہی اصول روپے کے معاملے میں بھی کام کرتا ہے۔اگر بازار میں روپے کی افراط ہوجائے تو روپے کی قیمت گر جا گی ۔روپے کی قیمت گرنے کا مطلب ہے کہ کسی چیز کو خریدنے کیلئے آپ کو زیادہ دام دینا پڑیں گے۔دوسرے الفاظ میں مہنگائی اور ستائی کا تعلق اس روپے کی مقدار میں کمی بیشی سے ہے جو بازار میں گردش کر رہا ہوتا ہے۔یہی وجہ تھی کہ جب یورپ کے بازاروں میں سونے چاندی کی بھرمار ہوگئی تو قیمتیں بڑھ گئیں۔1

حالانکہ اس اصول کو اٹھارویں صدی کے ماہرین معاشیات نے نمایاں طور پر پیش کیا،لیکن کچھ لوگوں کو سولہویں صدی میں اس بات کا شعور ہونے لگا تھا کہ چیزوں کی قیمتوں میں کمی بیشی کا تعلق چیزیں بیچنے والوں کی نیکی یا بدی سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے ایک قانون کام کر رہا ہوتا ہے۔چنانچہ سولہویں صدی کے ژاں بوداں کی ایک کتاب میں ہمیں یہ تحریر ملتی ہے:

> ''میرے خیال میں یہ گرانی تین وجوہ سے پیدا ہوئی ہے۔ان میں سب سے بڑی اور غالباً اکلوتی وجہ ہے (جس کی طرف اب تک کسی کی نگاہ نہیں گئی ہے) سونے اور چاندی کی زیادتی۔اس وقت ان دھاتوں کی اتنی بڑی مقدار اس سلطنت میں موجود ہے جتنی پچھلے چار سو برسوں میں پہلے کبھی نہیں تھی۔''

افراط زر کے اس دور میں جن لوگوں نے سب زیادہ فائدہ اٹھایا وہ تاجر طبقہ تھا۔چونکہ لوگوں کے پاس پیسہ تھا،تاجروں نے اسی حساب سے چیزوں کی قیمتوں میں اضافہ کیا اور خوب کمایا۔لیکن معاشرے کے کچھ اور گردش ایسے بھی تھے جنہیں افراط زر نے شدید پریشان کر دیا اور ان کا جینا دو بھر ہوگیا۔یہاں تک کہ خود حکومتوں کے لئے اپنے مصارف پورے کرنا مشکل ہوگیا کیونکہ حکومتوں کی آمدنیاں مقرر تھیں،اس طرح جس طرح ان کے اہل کاروں کی تنخواہیں۔اب یہ زمانہ ایسا

تھا جس میں بہت تبدیلیاں آ رہی تھیں اور قومی بنیادوں پر حکومتوں کا عروج ہو رہا تھا۔ لیکن حکومتوں کا مالی نظام پرانا تھا جو ان نئے حالات کیلئے موزوں نہیں تھا۔ اسی دور میں قیمتوں میں اضافہ ہونے

1۔ آج جب یہ سطور لکھی جا رہی ہیں تو ہم پاکستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں اسی صورت حال سے دوچار ہیں۔ پاکستان کے مخصوص حالات میں آج ایک طرف ہیروں کی ناجائز تجارت تے بے پناہ روپیہ بازار میں آ گیا ہے تو دوسری طرف وہ روپیہ ہے جو بیرون ملک گئے ہوئے پاکستانی اپنے بیوی بچوں کو بھیجتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی بڑے پیمانے پر سمگلنگ نے روپے کی ریل پیل کر دی ہے۔ ان سب چیزوں نے مل کر (لیکن یاد رکھئے قومی پیداوار نے نہیں!) اشیائے صرف کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔ اسی طرح قرون وسطیٰ میں جب چاندی کے سکوں کی بڑی تعداد بازار میں آ گئی تو اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہو گیا۔

لگے جس نے پرانے مالیاتی نظام کی دیواروں کو اور بھی ہلا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہوں کو اپنی مالی دشواریاں حل کرنے کے لئے نئے ابھرتے ہوئے روپے والوں کا سہارا لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس طبقے نے بادشاہوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر اس زمانے میں ان سے بہت سی مراعات حاصل کر لیں۔ چنانچہ اس دور میں جو سیاسی انقلاب آیا جس نے آہستہ آہستہ طاقت کا توازن متوسط طبقوں کے حق میں کر دیا اور اس طبقے کے اثر و اقتدار کو زبردست طور پر آگے بڑھایا، اس کا بہت گہرا تعلق قیمتوں میں اضافے سے تھا۔

مہنگائی سے جس طبقے کو مصیبت کا سامنا کرنا پڑا وہ محنت کش طبقہ تھا۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جب قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے تو اجرتوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ مگر کبھی بھی اجرتوں میں اضافہ اس حساب سے نہیں ہوتا جس حساب سے قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ اجرتوں میں جو کچھ بھی اضافہ ہوتا ہے اس کیلئے محنت کشوں کو لڑنا پڑتا ہے۔ ورنہ ان کے لئے یہ راستہ ہے کہ یا تو جہاں تک ہو سکے وہ اپنے مصارف میں اور کمی کر دیں یا پھر بھکاری بن جائیں۔ پندرھویں اور سولہویں صدیوں میں تینوں ہی باتیں ہوئیں۔ محنت کش طبقوں کی بغاوتیں بھی ہوئیں، ان کا معیار زندگی اور بھی گر گیا، اور بہت بڑی تعداد میں وہ بھکاری بھی بن گئے۔ ایک اور طبقہ جو قیمتوں کے اضافے سے بہت متاثر ہوا اس میں وہ لوگ شامل تھے جن کی آمدنیاں مقرر تھیں۔ ان میں چھوٹے درجے کے مالکان املاک، تنخواہوں اور پنشنوں پر گزر بسر کرنے والے لوگ شامل تھے۔ ان میں سے بہت سے غربت کا شکار ہو گئے۔ جن لوگوں کی زندگی کا دارومدار زمین کی مقررہ آمدنی پر تھا وہ بھی قیمتوں کے اس غیر معمولی اضافے سے بہت متاثر

ہوئے۔ جاگیرداری دور کے ابتدائی زمانے میں وہ اس کے کھیت پر بیگار کرتا اور ساتھ اپنے کھیت بھی جوتتا تھا۔لیکن جب زمانہ بدلا ،شہر وجود میں آئے تو دیہات اس نظام میں بھی تبدیلی آ گئی اور زمیندار اپنے کھیت کو مقررہ کرائے پر کاشت کے لئے دینے لگا۔لیکن اب جب اشیائے صرف کی قیمتوں میں اضافہ شروع ہوا اور زمینداروں کی اپنی زندگی بھی گرانی کا شکار ہونے لگی تو وہ اپنے کھیتوں کے کرایوں میں اضافہ کرنے کا سوچنے لگے، پھر وہ بڑے جاگیردار اور دولتمند لوگ تھے جنہوں نے زمینیں، جاگیریں پائی تھیں یا چرچ کی وہ زمینیں جو بادشاہوں نے ضبط کرالی تھیں یا خرید لی تھیں۔ان زمینوں میں اضافے کا خواہش مند تھا۔لیکن آخر اس کی صورت کیا ہو سکتی تھی؟

اس کی دو شکلیں ظاہر ہوئیں۔احاطہ بندی، اور کرایوں میں بے تحاشہ اضافہ۔زمینوں کی احاطہ بندی کا رواج پورے یورپ میں رائج ہو چکا تھا لیکن انگلستان میں اس رواج نے کچھ سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ابتدا میں کھیتوں کے گرد باڑھ نہیں ہوتی تھی اور کسانوں کے کھیت ایک دوسرے سے ملے ہوتے تھے۔اس کا انقصان یہ تھا کہ کوئی کسان اگر اپنی زمین پر نئے طریقوں سے کاشت کرنا چاہتا تھا تو وہ یہ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اسے دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنا ہوتا تھا۔اس وجہ سے کسانوں اور زمینداروں نے اپنی زمینوں کی احاطہ بندی شروع کر دی۔لیکن سولہویں صدی میں ایک دوسرے قسم کی احاطہ بندی نے رواج پایا۔یہ بھیڑیں پالنے کے لئے احاطوں کا رواج تھا۔یہ وہ زمانہ تھا جب انگلستان میں اون باہر سے منگوانی پڑتی تھی۔ضرورت نے بھیڑوں کی افزائش پر کسانوں کو مائل کر دیا اور انہوں نے زمین پر کاشت سے ہاتھ کھینچ لیا اور اپنے کھیتوں کو چراگاہوں میں تبدیل کرنا شروع کر دیا۔لیکن اس سے وہ کسان جو کھیتی باڑی میں مصروف رہتے تھے وہ بیکار ہونے لگے بھیڑوں کے فارموں کے لئے مقابلہ کم افرادی قوت کی ضرورت ہوتی تھی۔اس زمانے میں ایک گروپ نے بے دخل ہونے والے کسانوں کی زبوں حالی کی طرف توجہ دلانے کیلئے پمفلٹ شائع کرنا شروع کئے جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان پر کتنی مصیبتیں ٹوٹیں۔

آمدنی میں اضافے کا دوسرا طریقہ کرایوں میں اضافہ تھا۔پرانے زمانے میں کرائے اور جرمانے رواج کے مطابق لگائے جاتے تھے جس سے کسانوں کو کچھ تحفظ حاصل تھا۔مگر اب زمینداروں نے رواجوں کو قطعی نظر انداز کر کے کرایوں، جرمانوں، نذرانوں میں بے تحاشہ اضافہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ایک مقصد یہ تھا کہ کاشتکار زمین چھوڑ دیں اور زمیندار اس کو بیچ

سکیں۔یہی ہوا اور بڑے پیمانے پر۔اس صورت حال نے کسانوں کو جس تکالیف میں مبتلا کیا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل درخواست سے ہوتا ہے جو اس زمانے کے ایک پمفلٹ میں شائع ہوئی تھی:

''ہم بڑی منت اور سماجت سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ لوگ جو زمینوں ، چراگاہوں اور رہائشی مکانات کے مالک ہیں ہم پر رحم کھائیں، اپنے کرایہ داروں کا خون نہ چوسیں اور غیر معقول نذرانے اور قسمیں نہ وصول کریں۔خدا انہیں توفیق دے کہ وہ اس رقم کو جو ان کو مل رہی ہے اس پر قناعت کریں اور گھروں سے اور زمینوں کو زمینوں سے ملا کر کرایہ داروں کو بے دخل کر کے انہیں غربت کے غار میں نہ دھکیلیں ۔''

لیکن ان التجاؤں کا زمین کے مالکوں پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ احاطہ بندیکرنے اور زمین کا محصول بڑھانے سے باز نہ آئے۔پورے پورے گاؤں خالی ہو گئے ، بے دخل کاشتکار بھوکوں مرنے لگے اور پیٹ کی آگ سے تنگ آ کر چوریاں کرنے لگے۔

اس صورت حال نے بادشاہوں کو خاصا پریشان کرنا شروع کر دیا۔سب سے اہم پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ فوج کا بڑا حصہ انہی کاشت کاروں میں سے آتا تھا اور اگر فوجیوں کے بھائی بند بھوکے مرتے ہیں تو فوج میں بے اطمینانی پھیلتی تھی۔بھوکے کاشت کاروں نے جگہ جگہ بغاوتیں شروع کر دیں اور احاطہ بندیوں کی توڑ پھوڑ شروع کر دی۔اس کے نتیجے میں حکومت مجبور ہو گئی اور احاطہ بندی کے خلاف قوانین پاس کئے جانے لگے۔سب سے پہلا قانون پندرھویں صدی کی آخری دہائی میں 1489 میں پاس کیا گیا اور پھر اس سلسلے کے دوسرے قوانین سولہویں صدی میں پاس ہوئے۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بار بار قوانین کے پاس ہونے کے باوجود زمینوں کے مالکوں کا ان پر کم ہی اثر ہوا۔

اس دور کی اس کشمکش اور تصادم نے بہت سے بنیادی تصوارت میں تغیرات پیدا کر دیئے۔پہلے زمین محنت کرنے والے یعنی کاشت کار کی محنت کے ساتھ مل کر اہمیت حاصل کرتی تھی اور یہی محنت اس کو قیمتی بناتی تھی۔لیکن اب وقت کے بدلنے کے ساتھ تجارت وصنعت کی ترقی اور قیمتوں کے انقلاب نے روپے کو آدمی سے زیادہ اہم بنا دیا۔اب زمین بذات خود ایک آمدنی کے ذریعے کی حیثیت سے اہمیت حاصل کرنے لگی اور جائیداد میں تبدیلی ہو گئی جس پر

سٹہ لگنے کا رواج شروع ہوا اور صرف روپیہ پیدا کرنے کی نیت سے اسے خریدا اور بیچا جانے لگا۔

اگلی صدی میں جب شہروں میں جگہ جگہ صنعتیں لگنا شروع ہوئیں اور کارخانوں کے لئے مزدوروں کی ضرورت ہوئی تو زمین سے نکالے جانے والے یہی خانماں برباد شہروں کی طرف بڑی تعداد میں روانہ ہوئے اور کارخانوں میں مزدوری کر کے اپنے پیٹ پالنے لگے، یہیں سے صنعتی سرمایہ داری کا بیج پڑا۔

مزدوروں کی ضرورت.....

دوسال کی عمر والے بھی درخواست دے سکتے ہیں!

اب ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ سرمایہ داری نظام کا دور۔ مارکیٹوں میں توسیع کا دور۔ یہ مارکیٹوں میں توسیع ہے جو سرمایہ داری کا دوری نظام کے فروغ میں ایک انجن کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک چھوٹے اور ٹھہرے ہوئے بازار کے لئے چیزیں پیدا کرنا اور بات تھی۔ اس دور میں کاریگر اپنے گاہک کے لئے اس کی فرمائش کے مطابق چیزیں تیار کرتا تھا، لیکن جب ان بازاروں نے قصبوں اور شہروں کی منزل سے گذر کر ایک قوم کی شکل اختیار کر لی تو بازار یا مارکیٹ کی نوعیت ہی بدل گئی۔ ایسے مارکیٹ کے لئے اشیاء تیار کرنا بالکل ہی مختلف عمل ثابت ہوا۔

قرون وسطیٰ میں تاجروں اور دستکاروں کی جو گلڈز تھیں وہ ایک چھوٹے اور مقامی بازار کیلئے موزوں تھیں۔ لیکن جب بازار نے قومی اور پھر بین الاقوامی شکل اختیار کر لی تو قدیم گلڈ کا نظام نکارہ ہو گیا۔ مقامی کاریگر صرف مقامی تجارتکے اصول سمجھ سکتا تھا۔ لیکن ایسی تجارت کو چلانا جو پورے ملک ہی نہیں بلکہ پورے کرہ ارض سے تعلق رکھتی ہو، ایسی تجارت اب پرانے دستکار کے بس کا روگ نہیں تھی۔ جیسے جیسے مارکیٹ پھیلنا شروع ہوا ویسے ویسے ایک نئے ادارے کی شروعات ہوئی۔ یہ تھا ''درمیانی آدمی'' (middle man)۔ دستکاری کے دور میں دستکاری کے گلڈ کا ماسٹر (استاد) اور کرتا دھرتا صرف چیزوں کے بنانے والا ہی نہ تھا بلکہ کچھ اور بھی تھا اس کے فرائض میں چار خاص باتیں اور شامل تھیں: اولاً جہاں تک اپنی مصنوعات کے لئے خام مال کی خرید اور تلاش کا تعلق تھا وہ ایک تاجر کی حیثیت رکھتا تھا۔ دوئم، چونکہ اس کی ماتحتی میں مال بیچنے

والے، کاریگراورشاگردکام کرتے تھےاس لئے وہ ایک آجر کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔دوئم۔چونکہ اس کی ماتحتی میں مال بیچنے والے، کاریگراورشاگردکام کرتے تھےاس لئے وہ ایک آجر کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔سوئم ،وہ اپنے کاریگروں کی نگرانی اوران کے کام کی دیکھ بھال بھی کرتا تھا۔اس حیثیت سے وہ اپنے کارخانونے کا ایک طرح سے فورمین بھی ہوتا تھا۔اس کی آخری ذمہ داری اپنے کارخانے کی بنی ہوئی چیزوں کی فروخت ہوتی تھی ۔اس حیثیت سے وہ ایک دکاندار کے فرائض بھی سرانجام دیتا تھا۔لیکن جب درمیانی آدمی یاmiddle man نمودار ہوتا ہےتواب ماسٹر دستکار کے فرائض گھٹ کرصرف تین رہ جاتے ہیں۔تجارت اودکانداری کے فرائض سے وہ بالکل آزاد ہو جاتا ہے۔یہ درمیانی آدمی اب خام مال اس تک پہنچاتا ہےاور خام مال سے بنی ہوئی مصنوعات اکٹھی کر کے لے جاتا ہے۔

اس درمیانی آدمی نے منڈی کی ضرورتوں کومحسوس کرتے ہوئے شروع میں اشیاء کی تیاری پرغیرارادی طور راثر انداز ہوتا شروع کیا۔یعنی وہ کاریگرکومشورہ دینے لگا کہ فلاح طریقے سے تیارکی جائےاواس قسم کی اس کی شکل وصورت ہوتو مانگ میں اضافہ ہوسکتا ہے۔اس طرح مڈل مین نے کاریگر کو خاص قسم کی اشیاء تیار کرنے کی راہ پر لگایا یہ سپشلا ئز یشن (specialization) کی طرف پہلا قدم تھا جس کوسترھویں صدی کے مشہور ماہراقتصادیات ولیم پیٹی نے اس طرح بیان کیا ہے:

> ''کپڑا اس وقت سستا تیار ہوتا ہے جب ایک شخص دھنتا ہے دوسرا کاتتا ہے، تیسرا بنتا ہے، چوتھا تھان کھینچتا ہے اور دوسرے لوگ علیحدہ اس کوصاف کرتے ،استری کرتے اور باندھتے ہیں۔اگر یہ سب کام ایک ہی آدمی کرے اوراناڑی پن سے انجام دے تو کپڑا اس وقت نہ تو بہتر تیاہوسکتا ،نہ جلدمنڈی میں آسکتا ہیاور نہ ہی سستا ہوسکتا ہے۔''

جب کسی خاص چیز کے تیار کرنیکے لئے بہت سے آدمیوں کی ،خدمات حاصل کیجائیں تو کام بہت سے آدمیوں کے درمیان بٹ جاتا ہے۔ہرآدمی صرف اپنامخصوص کام کرتا ہے بار بارایک کام کرنے سے اس خاص کام میں اس کی مہارت بڑھ جاتی ہے۔یہ طریقہ وقت بھی بچاتا ہےاور پیداوار کی رفتار بھی تیز کرتا ہے۔یہ نئی باتیں تھیں جواس منچلے مڈل مین کے ذہن سے نکل رہ تھیں۔اس نے مسلسل دباؤ ڈال کرصنعتکاروں کے پرانے طورطریقوں کے بدلنے میں بڑا

اہم رول ادا کیا۔ایک زمانے میں ہم پیشہ دستکاروں کی گڈز کے سوچنے کا طریقہ بالکل مختلف تھا۔ان کو ہمیشہ یہ فکر رہتی تھی کی وہ کس طرح اپنی تیار کردہ مصنوعات پر اجارہ دارے قائم رکھیں ۔وہ اپنے مقابلے کے دستکاروں کو بڑے شک کی نگاہ سے دیکھتے اور کسی کو اپنے پیشے میں داخل نہیں ہونے دیتے ۔حتیٰ کہ گلاسگو کے مشین سازوں کی انجمن نے جیمز واٹ (james watt) کو صرف اس بنا پر بھاپ کے انجن پر کام جاری رکھنے کی اجازت نہ دیکہ وہ ان کی انجمن کارکن نہیں تھا۔مڈل مین ان تمام اجرہ داریوں اور تنگ نظری کے مخالف تھا۔وہ دیکھ رہا تھا کہ صنعتیں نئے اندز سے بڑھ رہی ہیں اور پھیل رہی ہیں۔اس لئے اب پرانے طور طریقوں اور فرسودہ بندھنوں کو ختم ہونا چاہیے۔چنانچہ مڈل مین اور پرانی گلڈز کے درمیان طویل عرصے تک کشمکش جاریرہی۔

بالاخر مڈل مین نے ان پرانے اور دقیانوسی بندھنوں سے بھاگ کر دیہات میں جا کر خود صنعت لگانے کا کام شروع کر دیا۔یہاں وہ مزدوری کی ان شرحوں اور ان ضابطوں سے آزاد ہو تا جو شہروں میں اس کے ہاتھ اور پاؤں جکڑے ہوئے تھے۔مشہور ناول **روبنسن کروسو** کے خالق ڈینیل ڈیفو (Daniel Defoe) نے 1724 عیسوی میں اپنی کتاب **برطانیہ عظمیٰ کا سفر** میں انگلستان کے دیہاتوں کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:۔

''کپڑا بنانے والوں کے گھروں اور جھونپڑے بڑی تعداد میں پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان میں کام کرنے والے مزدور رہتے ہیں ، ان میں سے بعض دھنتے ہیں،بعض بنتے ہیں،عورتیں اور بچے سب ہی کام میں مصروف نظر آتے ہیں۔ان گھروں میں کوئی بیکار نظر نہیں آتا، چار برس کے بچے بھی اور بوڑھے بھی۔''

وہ آگے چل کر لکھتا ہے

''ان لوگوں نے مجھے بریڈفورڈ میں بتایا کہ کوئی کپڑے کا کام کرنے والا دس ہزار پاؤنڈ سے لے کر چالیس ہزار پاؤنڈ سے کم حیثیت کا مالک نہیں ہے۔بہت سے خاندان بڑی بلند حیثیت کے مالک بن گئے ہیں۔چنانچہ نیو بری کے مشہور صنعت کار کی کپڑے کی گانٹھیں جب لندن روانہ کی جارہی تھیں تو شاہ جیمز نے گانٹھوں کے یہ انبار دیکھ کر پوچھا یہ کس کی گانٹھیں ہیں لوگوں نے نیو بری کے جیک کا نام لیا تو بادشاہ نے کہا کہ پھر تو جیک مجھ سے زیادہ مالدار ہے۔''

اب بازار کی بڑھی ہوئی طلب کا تقاضا تھا کہ سرمایہ دارانہ بنیاد پر بھاری صنعتوں کی از سرنو تنظیم کی جاتی ۔ان صنعتوں کو چلانے کیلئے بڑی زبردست اور قیمتی مشینوں کی ضرورت تھی اس ضرورت کی بڑی واضح مثال سولہویں صدی کی کوئلے کی کانوں سے کوئلہ نکالنے کے لئے زیادہ گہرائی میں کھدائی کی ضرورت پیش آئی ۔اس کام کے لئے ایک طرف نئی اور بھاری مشینری مطلوب تھی تو دوسری طرف ان مشینوں کی تیاریکے لئے زبردست سرمایہ مطلوب تھا۔اسی طرح دھاتوں کی کانوں کے لئے بہت بڑا سرمایہ درکار تھا۔ چنانچہ مطلوبہ سرمایہ پورا کرنے کے لئے پھر جوائنٹ اسٹوک کمپنیاں قائم کی گئیں اور دولتمندوں کی ایک تعداد نے مل کر ضروری سرمایہ اکٹھا کیا۔ یہی صورت اس سے پہلے ابتدائی تجارتی مہموں میں بھی پیش آئی تھی ۔اب صنعت کی ترقی کے لئے بھی یہی قدم اٹھایا گیا۔

نئے ملکوں کی دریافت نے نئی صنعتوں کیلئے تازہ گنجائشیں پیدا کیں۔شکر سازی اور تمباکو کی صنعت نے فروغ پایا۔حکومتوں نے ان لوگوں کی جو ان صنعتوں میں اپنا روپیہ لگا سکیں بڑے بڑے اجارے اور مراعات دیں ۔یہ صنعتیں شروع ہی سے سرمایہ دارانہ بنیاد پر قائم ہوئیں۔سولہویں صدی عیسوی سے لے کر اٹھارہویں صدی تک کے دوران قرون وسطیٰ کا خود مختار دستکار کاریگر غائب ہو گیا،اور اس کی جگہ ایک ایسے بڑھتے ہوئے طبقے نے لے لی جس کی زندگی ہر طرح اس سرمایہ دار درمیانی آدمی پر منحصر تھی جو اس طبقے کو اجرات دے کر اس کے لئے کام مہیا کرتا تھا اور اس طرح بڑھتے اور پھیلتے ہوئے بازار کے لئے سامان تجارت تیار کراتا۔

اگر ہم ان تمام ادوار کو جو ایک دوسرے کے بعد آئے اور ایک دوسرے کی جگہ لیتے رہے الگ الگ مرتب کر لیں تو ہم کو صنعتی تنظیم اور اس کی تدریجی ترقی کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

1۔گھریلو پیداواری نظام:

گھر کے مختلف ممبر اپنی ضروریات کی چیزیں پیدا کرتے تھے۔اس سے مقصود تجارت نہ تھی کیونکہ ان کو بازار کی طلب پوری کرنے کے لئے کوئی کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔

1۔دوسروں کے ذریعہ مصنوعات

سپلائی کرنے کا نظام:

بڑھتے اور پھیلتے ہوئے بازار کے لئے گھروں پر کام رہتا تھا۔ ماسٹر چند دستکار ساتھیوں کی مدد سے جیسا دوسرے دور میں ہوتا تھا کام کرتا، فرق صرف اتنا تھا کہ یہ استاد اب آزاد نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ اپنا کام جاری رکھنے کے لئے خام مال اور اوزار ایک درمیانی آدمی یا آنترے پرونیور سے لیتا تھا۔ اب دستکار اور خریدار کے درمیان براہ راست کوئی رشتہ نہ تھا۔ ماسٹر کی حیثیت ایک مزدور کی ہو کر رہ گئی تھی جو اپنے حصے کا کام مقررہ معاوضے پر کرتا تھا۔ یہ نظام سولہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک رائج رہا۔

4۔ فیکٹری نظام:

اب وسعت پذیر لیکن چڑھتی اور اترتی ہوئی قیمتوں کے بازار کے لئے گھروں کی بجائے سرمایہ دار مالک کی بنائی ہوئی عمارتوں میں کام ہونے لگا۔ اس کام کی بڑی نگرانی کی جانے لگی۔ اس دور میں کام کرنے والوں نے اپنی آزادی بالکل کھو دی۔ اب نہ ان کے پاس خام مال ہوتا تھا اور نہ ہی وہ اب اپنے اوزاروں کے مالک تھے۔ اس مشینی دور میں کام میں مہارت کی اہمیت بھی اتنی نہیں رہی جتنا پہلے تھی۔ سرمایہ نے اس دور میں ہر زمانے سے زیادہ اہمیت حاصل کر لی۔ انیسویں سے لے کر اب تک یہی نظام رائج ہے۔

میں یہ بات یہاں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ادوار کی تقسیم اندازوں سے کی گئی ہے، کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ کسی دور کے ختم ہونے سے پہلے ہی اس کے زوال کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً تیرھویں صدی میں جب گلڈز پورے شباب پر تھیں تو اسی دوران putting-out system کی بنیادیں شمالی اٹلی قائم ہو رہی تھیں۔ اسی طرح فیکٹری نظام نے اسی دور میں جسے ہم putting-out system کہتے ہیں جڑ پکڑ لی تھی۔ سولہویں صدی عیسوی کے نیوبری کے جیک کی مثال ہم پہلے ہی دے آئے ہیں۔ اس کے برعکس کبھی کبھی یہ بھی ہوا کہ کسی نئے دور کے شروع ہو جانے کے بعد بھی پرانے دور اور اس کے نظام کی باقیات مصروف عمل رہیں۔ یہی صورت

حال آجکل تیسری دنیا کے ملکوں میں ہے جہاں ہوائی جہاز بھی ہے، موٹر بھی لیکن اونٹ گاڑیاں، ریڑھے اور تانگے بھی رواں دواں ہیں۔

سونا، شان اور سرخروئی

کوئی ملک امیر کیسے بنتا ہے؟ کچھ بتا سکتے ہیں آپ؟ چلئے تفریح کے لئے ان چیزوں کی فہرست بنایئے جو آپ کے خیال میں کسی ملک کو دولتمند بنانے کے لئے ضروری ہیں، اور پھر ان کا مقابلہ کیجئے ان خیالات سے جو سترھویں اور اٹھارویں صدی کے ذہین لوگ اس موضوع پر لکھتے تھے۔ انہیں اس موضوع سے بہت دلچسپی تھی کیونکہ اس زمانے میں وہ ملک، یعنی قومی ریاست، کے حوالے سے سوچنے لگے تھے۔ ان کے سامنے سب سے بڑا سوال تھا کہ کیا وہ حالات جنہوں نے شہروں کو مالدار اور بڑا بنایا تھا، وہی پورے ملک کو مالدار بنا سکتے ہیں؟ سیاسی طور پر تو انہوں نے قومی ریاست بنالی تھی، اب ان کو یہ فکر تھی کہ معاشی طور پر بھی وہ اس ریاست کو عظیم اور خودمختار بنائیں۔

چنانچہ انہوں نے اس زمانے میں جو کچھ لکھا اور جیسے قوانین بنانے کیلئے سفارشیں کیں وہ سب پورے ملک کے حوالے سے تھیں۔ حکومتوں نے ایسے قوانین بنائے جن کے ذریعہ ان کے خیال میں پوری قوم مالدار اور طاقتور بن سکے گی۔ اور قابل غور یہ بات ہے کہ اس مقصد کو نظر میں رکھتے ہوئے انہوں نے روزمرہ زندگ کے ہر پہلو کی نگرانی کی اور سوچ سمجھ کر اپنی رعایا کے طور طریقوں اور سرگرمیوں کو خاطر خواہ انداز میں ڈھالا اور تبدیل کیا۔ اس سلسلے میں جو نظریات اور قوانین وضع کئے گئے ان کو مورخ ''سوداگروں کا نظام'' کا نام دیتے ہیں لیکن دراصل یہ کوئی باضابطہ نظام نہیں تھا جس کی پہلی کوئی تھیوری بنائی گئی اور پھر اس تھیوری پر عمل کیا گیا۔ بات ساری یہ تھی کہ حکومتیں ہمیشہ دیوالیہ اور مفلس رہتی تھیں، چنانچہ اس زمانے کے بڑے بڑے سیاستدانوں اور سوچ رکھنے والوں کے ذہنوں میں یہ خیال ایک ارجنٹ ضرورت بن کر ابھرا کہ آخر ملک دولت مند کیسے بنتے ہیں؟ ان کو کس قسم کی معاشی پالیسیاں اختیار کرنا چاہئیں کہ انک طاقت اور دولت میں اضافہ ہو؟

سولہویں صدی عیسوی میں غالباً سپین دنیا کا سب سے زیادہ مالدار اور طاقتور ملک تھا۔ سپین کی اس دور میں دولتمندی اور قوت کا راز ان سونے چاندی کے ذخائر میں مضمر تھا جو جنوبی امریکہ

میں اس کی نو آبادیوں سے ابل ابل کر آ رہے تھے۔ چنانچہ اس دور میں یہ اصول طے پا گیا کہ کسی ملک میں ان قیمتی دھاتوں کی جتنی مقدار ہوگی اتنا ہی وہ ملک دولتمند اور طاقتور سمجھا جائے گا۔ اس لئے ہم سترھویں اور اٹھارہویں صدی میں مختلف ممالک میں ایسے قوانین کی بہتات دیکھتے ہیں جس میں سونے چاندی کو اپنے ملک کی حدود سے باہر لے جانے پر سخت پابندیاں کی گئیں۔

لیکن اسی دور میں اس کے خلاف یہ احساس بھی ابھرنے لگا کہ یہ دھاتیں بذات خود جامد اور مردہ ہیں۔ یہ دولت اسی وقت پیدا کرتی جب ان کو استعمال کیا جائے۔ اسی نظریئے کے تحت انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر میں باقاعدہ ایک دفعہ یہ بھی تھی جس میں کمپنی کو سونا چاندی باہر بھیجنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اور جب سترھویں صدی میں بعض اہل قلم نے کمپنی کے چارٹر کی اس دفعہ پر اعتراض کئے تو کمپنی کے ایک ڈائریکٹر ٹومس من نے کمپنی کی پالیس کی حمایت میں ایک کتاب لکھی جس کا عنوان تھا ''**بیرونی تجارت سے انگریزی منافع**۔'' اس میں وضاحت کی گئی تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی خام مال خریدنے کے لئے مشرقی ملکوں میں سونا چاندی بھیجتی ہے۔ یہ خام مال انگلستان سے یا دوسرے ملکوں کو بھیج دی جاتی ہیں۔ دونوں صورتوں میں جو رقم ملتی ہے وہ اس رقم سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جو باہر بھیجی جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں سونا اور چاندی کی پہلے سے زیادہ مقدار ملک میں واپس لوٹ آتی ہے۔

اس لئے اب اس نئے دور میں دولت بڑھانے کی یہی تدبیر ٹھہری کہ قیمتی چیزیں باہر بھیجی جائیں اور صرف ضرورت کی چیزیں اپنے ملک میں منگوائی جائیں اور اس تبادلے میں اپنے مال کی جتنی قیمت بڑھے وہ نقد سکے کی صورت میں وصول کی جائے۔

یہ تدابیر کامیاب بنانے کے لئے ضروری تھا کہ صنعت کی ترقی کی ہر امکانی کوشش کی جائے کیونکہ زرعی مال کی بجائے مصنوعات کی قیمتیں دوسرے ممالک سے زیادہ حاصل ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ اس دور میں یورپ کے ہر ملک میں صنعتی ترقی کے لئے زبردست بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ اس مقصد کے لئے صنعتی میدان میں نئی نئی ایجادات لازمی ٹھہریں اور ان کی ضرورت اتنی شدت کے ساتھ محسوس کی جانے لگی کہ جرمنی کے علاقے بیوریا میں 1616 میں ایک ''برین ٹرسٹ'' (ذہین اشخاص کا ایک گروہ) قائم کیا گیا تا کہ یہ نئی نئی ایجادات کے لئے غور وفکر اور تجربات کریں۔

ہم اس زمانے کے یورپ کے معاملات کو جتنا غور سے پڑھیں اتنا ہی ہمیں احساس ہوتا

ہے کہ وہاں اپنی برآمدات کو بڑھانے کے لئے جو اقدامات چار پانچ صدیاں پہلے اٹھائے گئے تیسری دنیا کے رہنے والے اب اٹھا رہے ہیں۔ مثلاً سترھویں صدی کے ابتدائی دہائیوں میں جب برآمدات کا سلسلہ شروع ہوا تو یورپی حکومتوں نے اس دور میں باہر بھیجی جانے والی مصنوعات پر حکومتوں کی طرف سے مالی امداد دینی شروع کی تاکہ بیرون ملک یہ اشیاء سستے داموں بیچی جاسکیں، زیادہ تعداد میں بیچی جاسکیں اور صنعت کار کو زیادہ سے زیادہ مصنوعات تیار کرنے کی شہ ملے اور بیرونی منڈی میں یہ مصنوعات دوسرے ملکوں کی اس جیسی دوسری مصنوعات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرسکیں۔ دوسری طرف اپنی مصنوعات کو بیرونی مصنوعات سے حفاظت دینے کیلئے یورپ کے ممالک نے حفاظتی محصول لگانا شروع کر دیا تاکہ باہر سے آنے والی اشیاء مہنگی ہو جائیں اور ملکی اشیاء کا مقابلہ نہیں کرسکیں۔ چنانچہ انگلستان میں جب کپڑے کی صنعت کا آغاز ہوا تو اس صنعت سے متعلق صنعت کاروں کے نمائندے نے حکومت کو ایک عرضداشت پیش ی کی جس میں درج تھا۔

> ''میرا خیال ہے کہ میں نے اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ انگلستان اور آئرلینڈ میں کپڑے کی صنعت ابھی ابتدائی منزل میں ہے اس لئے کا سستا بیچنا ہمارے امکان سے باہر ہے۔ وہ لوگ جو عرصہ سے یہی کام کر رہے ہیں اور ان کی صنعت کی بنیادیں پوری طرح جم گئی ہیں ایسا کرسکتے ہیں، ہم حوصلہ افزائی کے بغیر جلد کسی ترقی کی امید نہیں دلا سکتے۔''

یہ حوصلہ افزائی حفاظتی محصول کی شکل میں آئی، یہ محصول بہت بڑھا چڑھا کر بیرونی مصنوعات پر لگایا گیا تھا۔ بعض خاص حالات میں حکومتوں نے باہر کی بعض مصنوعات کی درآمد بالکل ممنوع قرار دے دی۔ (آج بھی ترقی یافتہ ممالک ایک دوسرے کی مسابقت سے اور تیسری دنیا کی مصنوعات سے محفوظ رہنے کیلئے اسی حفاظتی محصول کا سہارا لے رہے ہیں ع۔م)

سترھویں۔ اٹھارویں صدی میں یورپی ملکوں نے اپنی اپنی صنعتوں کی ترقی کے لئے کارخانہ داروں کی مدد صرف سرکاری امداد اور بیرونی مصنوعات پر محصول اور پابندیاں لگا کر ہی نہیں کیں بلکہ غیر ملکوں کے ایسے ماہر کاریگروں کو بھی جو تجارت اور صنعت کی ترقی کے نئے نئے طریقے اور گر بتا سکیں، بلایا گیا اور نہیں اپنے ملک میں بسانے کے لئے تمام امکانی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ ان کو ترغیب دی گئی کہ اگر وہ آکر بس جائیں گے تو ان سے کوئی بھی ٹیکس وصول

نہیں کیا جائے گا۔ان کو رہائش کے لئے مکانات دیئے جائیں گے،ان سے کوئی کرایہ وصول نہیں کیا جائے گا،اوران کا اپنے کاروبار کے لئے بطور قرض سرمایہ بھی مہیا کیا جائے گا۔یہاں تک کہ اگر یہ کاریگر اور دستکار خوشی سے آنے کیلئے تیار نہ ہوتا تو حکومتیں کبھی کبھی ان کو اغوا کرنے سے بھی گریز نہ کرتیں۔سترھویں صدی عیسویں میں فرانس کے وزیراعظم کولبیر(colbert) نے ایسے ایجنٹ مقرر کر رکھے تھے جن کا صرف یہی کام تھا کہ وہ باہر کے دستکاروں کو فرانس میں آ کر کام کرنے پر آمادہ کریں۔چنانچہ کولبیر نے 28 جون 1669ء کو ڈرسڈن (جرمنی) میں اپنے سفیر موسیو شاساں کو لکھا:

''مہربانی کر کے اس بھرتی کے ایجنٹ کو ہر ممکن مدد دیجئے تا کہ یہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر سکے۔اس بات پر اعتماد رکھئے کہ چونکہ ان آہنگروں کو جو اس کے ذریعہ پہلے ہی فرانس میں لا کر آباد کئے جا چکے ہیں ہر طرح سے خوش رکھا جائے گا،یہ امر مزید کاریگروں کو ہمارے کارخانوں میں کام کرنے کے لئے ترغیب دے گا۔''

بیرونی کاریگروں کی یہ عزت کوئی نئی بات نہیں تھی بلکہ اس کی مثال ہمیں سولہویں صدی میں بھی ملتی ہے جب انگلستان میں ملکہ الزبیتھ کا راج تھا ملکہ نے ایک خط جو اسنے کمبر لینڈ اور ویسٹ مور لینڈ کے حاکمان عدالت کے نام لکھا اس سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ زمانے میں جب کہ معمولی خطاؤں پر انسانوں کی کھالیں کھنچوادی جاتی تھیں،ان کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا، پھانسیوں پر لٹکا دیا جاتا تھا،ایسے زمانے میں بھی ملکہ الزبیتھ کو بدیسی دستکاروں کے آرام کی کتنی فکر تھی۔یہ خط ایک جرمن دستکار کے متعلق تھا جو قتل ہو گیا تھا:

''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ بعض جرمنوں پر،جن کو انگلستان کی مہر سے ایک سند شاہی عطا کی گئی تھی اور جنہوں نے بڑی محنت،مہارت اور مصارف برداشت کر کے ہمارے صوبے ویسٹ مور لینڈ اور کمبر لینڈ کے پہاڑوں اور ان کی چٹانوں سے قیمتی معدنیات کی بڑی مقدار نکالی ہے اور جن کا ارادہ تھا کہ وہ ابھی اور معدنیات کے حصول کے لئے کھدائی جاری رکھیں گے،حملہ کیا گیا اور ہمارے امن پسندانہ قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بلوہ کیا گیا۔اس بلوے کے ذمہ دار ہمارے ان مذکورہ صوبوں کے چند امن شکن لوگ ہیں۔اس خوبی بلوے میں ایک جرمن جان سے مارا گیا ہے اور اندیشہ ہے کہ جرمنوں کی پوری جماعت دل شکستہ ہو جائے اس لئے ہم

تمہارے سپرد یہ خدمت کرتے ہیں اور تم کو حکم دیتے ہیں کہ ان تمام لوگوں کو جو اس فساد اور قتل کے ذمہ دار ہوں گرفتار کو لو اور اس کا پورا خیال رکھو کہ آئندہ ان جرمنوں کے ساتھ بہت دوستانہ اور نرم سلوک کیا جائے۔''

اس مکتوب سے ایک اور بات جو واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس دور میں دستکاری اور کاریگری میں جرمن انگریزوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھے، اس لئے انگلستان اور فرانس وغیرہ کو اپنی صنعتی ترقی کیلئے ان کی اشد ضرورت تھی اور ان کاریگروں کی حفاظت کا پورا انتظام کیا جاتا تھا۔ اسی طرح جو لوگ نئی چیزیں ایجاد کرتے تھے حکومتوں کی طرف سے ان کی بھی سرپرستی کی جاتی تھی۔ چنانچہ ژاں دی برادی فے نے جب 1611 میں ایک نئی قسم کی چکی بنائی تو حکومت نے اس کو چکیاں بنانے اور فروخت کرنے کی اجارہ داری بیس سالوں کے لئے عطا کر دی۔ جو حکم نامہ اس مقصد کے لئے جاری کیا گیا اس کے الفاظ یہ تھے:

''ہم نے (ژاں دی فے) کو اجازت دی ہے کہ وہ اور اس کے ساتھی اس کی ایجاد کے بموجب چکیاں ہماری مملکت کے ہر قصبے اور شہر میں بنائیں... ہم منع کرتے ہیں کہ کوئی اور شخص اس ایجاد کے نمونے پر مکمل چکی یا اس کا کوئی حصہ اس کی واضح اجازت اور منظوری کے بغیر نہ بنائے۔ اگر کوئی شخص اس حکم کی خلاف ورزی کرے گا تو اس پر دس ہزار لیور جرمانہ ہوگا اور اس کی چکی ضبط کر لی جائے گی۔''

غرضیکہ اس دور میں بالکل ہمارے زمانے کی طرح حکومتیں صنعتوں کی حوصلہ افزائی کے لئے ہر ممکن امداد دینے کے لئے تیار رہتیں۔ چنانچہ کولبیر کے زمانے میں فرانسیسی پارچہ باقی کی صنعت نے مختلف شکلوں میں اسی لاکھ لیور کی امداد حاصل کی، اور جب سترھویں صدی میں پارچہ بافوں کی بعض جماعتوں نے ایک ایسا کارخانہ قائم کرنا چاہا جس میں ریشم اور چاندی سونے کی تاروں سے قیمتی کپڑے تیار کیے جائیں حکومت نے ان کی حوصلہ افزائی کے لئے ان کو بہت سے حقوق عطا کئے اور ساتھ ہی ایک فرمان جاری کیا:

''عام رعایا کی بھلائی کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ بڑے پیمانے پر آرٹ اور صنعت کو فروغ دیا جائے۔ یہ دونوں چیزیں ہماری مملکت کی دولتمندی اور ترقی کے لئے بہت ضروری ہیں۔ اگر ہم نے اعلیٰ پیمانے پر بڑے بڑے صنعتی کارخانے قائم کر لئے تو ہم کو اپنے پڑوسیوں کے سامنے دست سوال پھیلانے کی ضرورت نہ

رہے گی اور اپنی ضرورت کے لئے دنیا کے دور دراز گوشوں کی خاک چھاننی نہ پڑے گی۔ ہماری یہ صنعتی ترقی ان تمام خرابیوں کا جو بیکاری سے پیدا ہوتی ہیں علاج کرد ے گی۔ سونے چاندی کی بڑی تعداد جو ہم اپنی ضروریات کی خریداری کیلئے باہر بھیجنے پر مجبور ہو جاتے ہیں پھر ملک سے باہر نہ جایا کریں گے۔''

اس کے ساتھ ہی ایک دوسرے فرمان کے ذریعے ان دستکاریوں کو ان بڑے کارخانوں کو لگانے کے لئے کثیر رقم بطور مالی امداد دینے اور دیگر مراعات کا اعلان کیا گیا (اس طرح کی امداد کو آج کل سبسڈی کہتے ہیں)۔ یہ وہ دور تھا جب اقتصادیات کی دنیا میں یہ نظریہ زور پکڑ رہا تھا کہ دو لت تجارت کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے اور تجارت کا فروغ صنعتوں کے فروغ کے ذریعہ ہوتا ہے ۔صنعتوں کی برآمدات کے باعث نہ صرف تجارتی توازن ملک کے موافق ہو جائے گا اور اس طرح ملک کی دولت بڑھے گی، بلکہ زیادہ کارخانوں کے لگ جانے سے بیروزگاری کا مسئلہ بھی بڑی حد تک حل ہو جائے گا۔

یہ دور وہ تھا جب یورپ میں بھکاریوں اور بے روزگاروں کے جھنڈ کے جھنڈ حکومتوں کے لئے پریشانی کا باعث بن رہے تھے اور ان کی بہبود پر حکومتوں کو زر کثیر صرف کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے اس زمانے میں ماہر اقتصادیات صنعتوں کے ساتھ ساتھ غلے کی پیداوار میں بھی اضافے پر اصرار کر رہے تھے۔ بادشاہوں کو اس معاملے سے دلچسپی اس لئے تھی کہ اگر ان کی رعایا کی جسمانی حالت اچھی ہوگی تو انہیں جنگ کیلئے ہٹے کٹے سپاہی میسر آسکیں گے۔ یہ سب کو معلوم تھا کہ جنگ کے زمانے میں غذائی اشیاء کی کافی رسد بہت اہمیت رکھتی ہے، چنانچہ غلے کی پیداوار بڑھانے کے لئے بھی انگلستان اور دوسرے ملکوں میں سرکاری خزانے سے امداد دی جاتی تھی۔

لیکن اس دور کی جنگیں سمندروں پر بھی لڑی جاتی تھیں۔ اس لئے حکومتوں کو صرف تندرست نوجوانوں کی ہی نہیں بلکہ اپنے جنگی بحری جہازوں کی تعداد بڑھانے کی بھی فکر لاحق رہتی تھی۔ چنانچہ اس دور کے ماہرین اقتصادیات بھی تجارتی بیڑے کی اشد ضرورت محسوس کرتے تھے اور وہ حکومتیں بھی جو بیرونی تجارت میں دلچسپی لے رہی تھیں اپنے تجارتی بیڑوں کو سہولتیں دینا چاہتی تھیں تاکہ ان کا سامان تجارت آسانی سے دوسرے ملکوں کے ساحلوں تک پہنچایا جاسکے۔ اس لئے دیگر صنعتوں کے ساتھ ساتھ جہاز سازی کی طرف بھی توجہ دی جانے لگی اور جہاز سازی کی صنعت کے لئے حکومتوں نے بھرپور امداد دی۔ اس صنعت میں دلچسپی لینے والوں

کے لئے مالی امداد کیساتھ ساتھ خام مالی مثلاً کولتار، لکڑی کے تختے اور بہت سی دیگر اشیاء کی ضرورت ہوتی تھی۔ حکومتوں نے جہاز بنانے والوں کی مدد کرنے کیلئے یہ سب اشیا سستے داموں پر فراہم کیں۔ مزید یہ کہ بحری خدمات کیلئے جبری بھرتی کی گئی۔ فرانس کی حکومت نے عدالتوں کو ہدایت کی کہ وہ مجرموں کو جہاں تک ممکن ہو بادبانی جہازوں میں کام کرنے کی سزائیں دیں۔ اس طرح سے یورپ کے اکثر ملکوں میں ماہی گیری کی صنعت کو بھی فروغ دیا گیا غرض یہ تھی کہ اس پیشے میں ملاحی کی تربیت خود بخود ہو جائے گی۔ مچھلی کی اہمیت اور بطور غذا کے اس کے فوائد کا خوب چرچا کیا گیا سا کہ مچھلی کی مانگ میں اضافہ ہو کیونکہ اس اضافے سے ماہی گیری کی صنعت کو بھی فروغ ملے گا اور ملاحوں کی تربیت کو بھی!

سولہویں صدی تک یورپ کے سمندروں میں سپین کا طوطی بولتا تھا لیکن سولہویں صدی کیا آخر میں سپین کا زوال شروع ہوا اور اسکی جگہ چھوٹے سے ملک ہولینڈ نے لے لی۔ یہ ملک اپنے دور کی اول درجہ کی بحری طاقت بن گیا۔ ہولینڈ اگر چھوٹا سا ملک تھا لیکن جہاز سازی کی صنعت میں خاص ترقی کرنے کی وجہ سے بہت دولت مند اور طاقتور ہو گیا۔ وینس کی طرح ہولینڈ کے رہنے والوں نے اپنے جغرافیائی سہولت اور محل وقوع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور انہوں نے کشیوں کے متعلق اچھی خاصی معلومات حاصل کر لیں۔ شمالی سمندر جو مچھلیوں کی دولت سے مالا مال تھے، ہولینڈ کے حوصلے مندوں کو اپنی طرف کھینچتے تھے۔ شمالی ملکوں کی پیداور بحیرہ روم آتے جاتے ہوئے ہالینڈ کے ساحل سے (جو بیچ میں پڑتا تھا) گزرتی تھی اور مہم جوڈچوں کو اپنے محل وقوع سے فائدہ اٹھانے کا پورا پورا موقع ملتا تھا۔ انہوں نے اپنے سمندروں کو کارگاہ عمل بنالیا اور ڈچ کشتیاں سبک خرامی سے پوری دنیا کا سامان تجارت ادھر سے ادھر لے جانے اور پہنچانے لگیں۔

ڈچ جہاز راں مدتوں سمندروں پر چہار طرف چھائے رہے لیکن فرانس اور انگلستان کب تک ہولینڈ کی سمندری بالادستی قبول کر سکتے تھے۔ چنانچہ سمندروں میں ڈچ جہاز رانوں کی اجارہ داری کو ختم کرنے کے لئے انگلستان نے 1660 عیسوی میں ایک قانون منظور کیا جو انگلستان کی اس ضرورت کا اظہار کرتا ہے قانون کے الفاظ یہ تھے۔

''فن جہاز رانی کو ترقی دینے کے لئے اور انگریز قوم کو جہاز رانی کا شوق دلانے کے لئے یہ قانون بنا جا رہا ہے کہ یکم دسمبر 1660 عیسوی کے بعد کوئی عام سامان تجارت

اس ملک یا نو آبادیات سے جو ایشیا، افریقہ یا امریکہ میں ہیں سوائے انگریزی یا آئرش جہازوں کے، جو دراصل انہی ملکوں کے باشندوں کی ملکیت ہوں، اور کسی جہاز پر نہیں لے جایا جائے گا۔ اور نہ دوسرے ملکوں سے کوئی سامان ان ملکوں تک سوائے ان جہازوں کے جو ان ملکوں کی ملکیت ہوں اور کسی جہاز میں لایا جائے گا۔ ان جہازوں کا مالک انگریز اور ان جہازوں کے ملاحوں کی کم سے کم تین چوتھائی تعداد انگریز ہونی چاہئے۔''

انگریزوں نے جواب ایک بڑی سامراجی طاقت تھے، اس قانون کے ذریعہ ڈچ جہازوں کو اپنی سلطنت میں گھسنے سے روک دیا تھا، گویا انہوں نے اس کے گرد ایک دیوار کھڑی کر دی تھی جس پر لکھا ہوا تھا:

ڈچ جہازو! سلطنت سے باہر رہو!

انہوں نے اپنی نو آبادیات پر بھی یہ لازم قرار دیا کہ وہ برطانیہ کی سی پالیسی اختیار کریں اور بیرونی جہازوں کو اپنے ساحلوں پر تجارت کرنے کی اجازت نہیں دیں۔ اس طرح امریکی نو آبادی کے باشندوں کے لئے طاقتور ڈچ جہاز راں کمپنیوں کے مقابلے کا بڑا اچھا موقع پیدا ہو گیا اور اب وہ آسانی سے اپنے تجارتی بحری بیڑے بنا سکتے تھے۔ وہ وقت جلد آ گیا جب امریکی کشتیاں ہر طرف دنیا کے ہر بندرگاہ میں چلتی پھرتی نظر آنے لگیں اور اس طرح سے بڑھتی ہوئی انگریزی سلطنت کی جہاز رانی کی صنعت میں امریکی جہاز سازوں نے صرف صنعت جہاز سازی میں ایک بڑا حصہ حاصل کر لیا بلکہ مالکان جہاز اور ملاحوں نے اس تجارت سے خوب خوب دولت کمائی۔ لیکن اب یہیں سے نو آبادیات اور ان گلستان کی مرکزی حکومت کے تضاد کا اظہار ہونا شروع، کیونکہ جہاز رانی کے قانون کے کچھ حصے ایسے بھی تھے جو نو آبادیات کے لئے نفع بخش نہ تھے۔ انگلستان کے حکومت کی اقتصادی ماہرین جو نو آبادیات نظام کے زبردست حامی اور مبلغ تھے، ان کا خیال تھا کہ نو آبادیات کو مادر وطن کی آمدنی کا ایک ذریعہ ہونا چاہئے چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے انگلستان کو حکومت جو قوانین وضع کرتی ان میں یہ خیال رکھا جاتا کہ نو آبادیات کے باشندوں کی ایسی صنعتیں لگانے سے باز رکھا جائے جن سے یہ ڈر ہو کہ وہ انگلستان کی صنعتوں کو مقابلہ کرنے لگیں گی۔ نو آبادیات کے لوگوں کو ٹوپیاں، ہیٹ، اونی اور لوہے کی

چیزیں بنانے سے روکا گیا حالانکہ ان تمام چیزوں کی صنعت کے لئے امریکہ میں خام مال کی کمی نہ تھی۔لیکن انگلستان کی غرض یہ تھی کہ وہ یہ خام مال امریکہ سے منگوائے اور خود اس خام مال سے چیزیں تیار کرے اور پھر اپنی مصنوعات کو امریکہ کی منڈی میں مہنگے داموں فروخت کرے۔

انگلستان کا یہ طرز عمل صرف امریکہ ہی کے ساتھ نہیں تھا بلکہ تمام نوآبادیات کے ساتھ اس کا یہی برتاؤ تھا۔متحدہ ہنوستان میں اس نے کپڑے کی صنعت تباہ کی تا کہ وہ مانچسٹر میں اپنی کپڑے کی صنعت کو فروغ دے سکے۔اسی طرح آئرلینڈ میں جب وہاں پر اونی کپڑے کی صنعت لگنا شروع ہوئی تو ایسے قوانین بنائے گئے جن کا سہارا لے کر وہاں اونی کپڑے کی صنعت کو ختم کر دیا گیا اور آئرش لوگوں پر یہ بھی پابندی لگا دی کہ وہ اپنی اون سوائے انگلستان کے کسی اور ملک کو فروخت نہیں کر سکتے۔

انگلستان اور اس کی نوآبادیات کے درمیان اختلاف کی وجوہ سمجھنے کے لئے یہ حقیقت پیش نظر رہنا چاہئے کہ انگلستان کے نزدیک نوآبادیات کو صرف انگلستان کی خدمات کے لئے زندہ رہنے کا حق تھا۔اس ضمن میں امریکہ کی ریاست میساچوسٹ میں برطانوی گورنر نے واضح طور پر حکومت برطانیہ کو مندرجہ ذیل سفارشات بھیجیں:

''امریکی تجارت کے متعلق برطانیہ عظمی کو حسب ذیل دو صورتیں اختیار کرنی چاہئیں۔

1۔امریکی رعایا کو مجبور کرنا چاہئے کہ وہ اپنی ضرورت کی تمام چیزیں برطانیہ سے خریدے۔اگر کچھ ایسی چیزیں ہوں جو برطانیہ میں نہ بنتی ہوں تو دوسرے ممالک سے بھی چیزیں برطانیہ کے ذریعے ہی خریدی جائیں۔

2۔امریکہ کی بیرونی تجارت کی تنظیم کچھ اس طرح کی جائے کہ نفع گھوم پھر کر برطانیہ کے خزانے میں آجائے۔اگر وہ برطانیہ کے خزانے میں نہ آسکے تو برطانوی سلطنت کی ترقی پر ہر حال میں صرف ہو۔''

چنانچہ اس زمانے میں یہ نظریہ رائج ہو گیا تھا کہ تجارت ہی واحد ذریعہ ہے

جس سے کسی حکومت کو اقتدار نصیب ہوتا ہے اور تجارت کی توسیع سے ہی کسی ملک کا اثر و رسوخ دوسرے ممالک تک وسیع ہوتا جاتا ہے۔تجارتی نظریہ زر دراصل اس دور کی فری مارکیٹ کا نظریہ تھا اور بنیادی طور پر ان دونوں نظریوں میں اور ان کی ضرورتوں میں کوئی چنداں فرق نہیں ہے۔تجارتی نظریہ کے حامیوں کا واضح عقیدہ تھا کہ جہاں تک تجارت کا تعلق ہے ایک ملک کا

نقصان دوسرے ملک کی تجارت کو نقصان پہنچایا جائے۔ اس فلسفے کا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ مد مقابل کو میدان سے ہٹانے کے لئے جنگ کی جائے۔ 1690 میں آرچ بشپ اوف کینٹر بری نے جو الفاظ کہے تھے وہ آج صحیح ہیں:

''دنیا میں برسوں سے جو لڑائیاں ہو رہی ہیں لوگ ان کے اصلی رنگ کو بعض اونچے اور روحانی نام دے کر چھپا لیتے ہیں، لیکن ان لڑائیوں کا آخری ماحصل اور حقیقی مقصد سوناشان اور دنیاوی اقتدار کے سوا اور کچھ نہیں۔''

ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو!

1776 کا سال بغاوت کا سال تھا۔ ایک یادگار سال۔ امریکیوں کے لئے یہ وہ سال ہے جب انہوں نے انگلستان کی سامراجی تجارت پالیسی کے خلاف بغاوت کر کے ''ڈیکلریشن اوف انڈی پنڈنس'' (آزادی کا اعلان) جاری کیا تھا۔ دنیا بھر کیماہرین معاشیات کیلئے یہ وہ سال ہے جب ایڈم سمتھ نے ویلتھ اوف نیشنز (قوموں کی دولت) شائع کی۔ یہ ایک باغیانہ کتاب تھی جو مروجہ معاشیاتی نظریہ کے خلاف تھی۔ اس نظریہ کے مطابق تجارت پر حکومت کا کنٹرول تھا اور اس نے بیسیوں قوانین بنا رکھے تھے جس میں معاشی سرگرمیاں پھنسی ہوئی تھیں۔ اٹھارویں صدی میں بہت سے لوگ تھے جو ان پابندیوں کو توڑنا چاہتے تھے۔ تاجر اور مالدار لوگ چاہتے تھے کہ وہ جہاں چاہیں، جس مقدار میں چاہیں روپیہ لگائیں۔ حکومت اور افسر شاہی ان کی سرگرمیوں میں رکاوٹ ڈالتے تھے۔ صنعتکار اور تاجر اس بات سے تنگ آ چکے تھے کہ اوپر سے احکام آئیں کہ تم یہ کرو، یہ مت کرو۔ یہاں محصول دو، یہاں ٹیکس ادا ایڈم سمتھ کی کتاب ''ویلتھ اوف نیشنز'' ان نظریات کی ترجمان تھی۔ لیکن اس کتاب میں صرف پرانی پالیسیوں پر حملہ ہی نہیں کیا گیا تھا بلکہ نہایت مدلل طریقہ پر دکھایا گیا تھا کہ قومیں دولت کس طرح پیدا کرتی ہیں اور اس کے پیچھے کونسے معاشی قوانین کام کرتے ہیں۔ اس مطالعہ سے ایڈم سمتھ نے یہ ثابت کیا تھا کہ معاشی زندگی صرف اس وقت پھلتی پھولتی ہے جب وہ پابندیوں سے آزاد ہو اور سرمایہ کاروں اور صنعتکاروں کو خود فیصلے کرنے کا اختیار ہو کہ وہ کہاں اور کس طرح اپنی معاشی سرگرمیاں کو جاری رکھیں۔ یہ صحیح ہے کہ حکومتیں صنعتوں کو مدد دینے کی خواہشمند تھیں۔ لیکن ان کے قوانین سے ہوتا یہ تھا کہ اگر ایک طبقہ کو

فائدہ ہوتا تھا تو دوسرے کو نقصان ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر 1700 کے سالوں میں جب پرشا (جرمنی) نے اون کی صنعت کو فائدہ پہنچانے کی خاطر یہ پابندیاں لگا دی کہ اون پیدا کرنے والے اون کو برآمد نہیں کر سکتے تو اون کا کپڑا بنانے والے صنعتکار تو یقیناً خوش ہوئے کیونکہ اس طرح انہیں اون سستی دستیاب ہونے لگی، لیکن اون پیدا کرنے والے سخت ناراض ہوئے، یہاں تک کہ 1721 میں انہیں بادشاہ کے سامنے عرضداشت پیش کرنا پڑی کہ یہ پابندی اٹھالی جائے۔ عرضداشت میں کہا گیا تھا کہ

''کارخانے دار تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے سٹاک میں اون کی بڑی مقدار موجود ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس سال اون کی پیداوار آدھی سے زیادہ نہ بک سکے گی۔ جناب والا نے صنعت کو فروغ دینے کے لئے محض اس خیال سے کہ کارخانہ داروں کو اون کی کمی نہ پڑے یہ فرمان نافذ فرمایا ہے۔ ہم جناب والا کے اس ارادہ کی نیکی کو محسوس کرتے ہیں۔ لیکن جو لوگ بھیڑیں پالتے ہیں ان کی دشواریاں دن بدن بڑھ رہی ہیں۔ اون کا سٹاک بڑھتا چلا جا رہا ہے اور مال کے پڑے ہونے کی وجہ سے اون اس قیمت پر بکے گی جو یہ کارخانہ دار لگائیں گے کیونکہ ان کو اب فوری طور پر اون کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ اگر اون کی برآمد پر پابندی جاری رہتی ہے تو اون کی قیمتیں مزید گرتی چلی جائیں گی اور بھیڑوں کے فارموں کی تباہی لازمی ہو جائے گی۔''

لیکن شاہ پرشا نے اون کی برآمد پر سے پابندی اٹھانے سے انکار کر دیا۔

بہرحال پرانی پالیسیاں ایسی تھیں کہ صنعتوں کی ترقی پر زور تو دیا جاتا تھا لیکن (آجکل کی طرح) شاہی افسر شاہی نے ان کے گرد سرخ فتیہ کا ایسا جال بنا رکھا تھا کہ اس میں صنعتوں کا دم گھٹ رہا تھا۔ ایڈم سمتھ کے علاوہ دوسرے ماہرین معاشیات نے بھی ان پابندیوں کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ جب فرانس کے ایک تاجر گورنے نے ان پابندیوں کی طرف پرزور طریقہ پر توجہ دلائی تو فرانس کے مشہور وزیر مالیات تو روَ (turgot) کو اس کا نوٹس لینا پڑا۔ اس نے گورنے کے حوالے سے لکھا:

''مجھے گورنے کی تحریر سے یہ معلوم کر کے بہت تعجب ہوا کہ فرانس کا کوئی شہری نہ کوئی چیز تیار کر سکتا ہے نہ بیچ سکتا ہے، تاوقتیکہ وہ ایک لمبی رقم خرچ کر کے کارپوریشن کا ممبر نہ بن چکا ہو۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ ایک ایسی مملکت میں جہاں تخت نشینی کا مسئلہ دستور اور آئین کے مطابق طے ہوتا ہو، ایک بادشاہ اپنی جگہ سے نیچے

اتر کر ایسے فرمان نافذ کرے گا جن کے بمو جب کپڑوں کی لمبائی چوڑائی تک حکومت کی طرف سے مقرر کی جایا کرے گی اور یہ فیصلہ بھی حکومت کے اہل کار ہی کریں گے کہ کتنے نمبر کا سوت کپڑے کی بنائی میں استعمال ہوگا' اور ان قوانین اور ضابطوں کی اتنی بہتات ہو جائے گی کہ چار موٹے موٹے دفتر ان ہدایات کی تفصیل سے بھر جائیں گے۔''

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ یہ گورنے ہی تھا جس نے پہلی دفع وہ نعرہ استعمال کیا جو اس کے بعد سرمایہ داری نظام کا مستقل نعرہ بن گیا۔ یہ نعرہ تھا جس کا قریب قریب مطلب ہے ''ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو! یہ نعرہ ایک نئے دور کا نعرہ ثابت ہوا جس نے کئی ایک اہم انقلابات کے دروازے کھول دیئے۔ اس نعرہ کو منظّم طور پر سب سے پہلے فرانسیسی فلسفیوں کے ایک گروہ نے اپنایا جو فزیوکریٹس (Physiocrats) کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ دراصل معاشیاتی مفکرین تھے جنہوں نے 1751 میں اپنی ایک جماعت بنائی تھی۔ ان لوگوں نے کتابیں اور مضامین لکھ کر اس مطالبے کا چرچا کیا کہ تجارت کو آزاد کیا جائے یعنی حکومت کی طرف سے تجارتی معاملات میں مداخلت ختم کی جائے۔ جب بادن کے حکمران کارل فریڈرک نے 1770 میں مشہور فزیوکریٹ میرابوا (mirabeau) سے درخواست کی کہ اسے اس کی سلطنت کے انتظام کے لئے کچھ مفید مشورے دے تو میرابو نے کہا

''آہ موسیو، اپنی رعایا کو سب سے پہلے آزاد بندگاہ اور آزاد میلے عطا کرو اور اپنے عزیز اور معزز نام کے بعد تین الفاظ اس طرح لکھوا کر آویزاں کروادو کہ تمھاری زمین پر قدم رکھتے ہی ان پر نگاہ پڑے۔ یہ الفاظ ہیں: آزادی۔۔حفاظت۔۔حریت۔ تمھارے ریاست بہت جلد آباد ہو جائے گی، تجارت کی قدرتی شاہراہ بن جائے گی، اور تمام لوگوں کے ملنے کیلئے ایک بین الاقوامی مقام میں تبدیل ہو جائے گی۔''

فزیوکریٹس آزاد تجارت پر اپنے یقین پر ذرا گھوم پھر کر پہنچے تھے۔ ان کا ایمان سب سے اول یہ تھا کہ نجی جائیداد مقدس ہے، اور خاص کر زمینی جائیداد۔ چونکہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ ہر شخص کو اختیار ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی جائداد کا کیا کرے اور اس کا یہ حق کسی طرح محدود نہیں ہونا چاہیے اس لئے وہ حریت کے بھی قائل تھے ان کے خیال میں دولت اصل میں زمین سے ہی

پیدا ہوتی ہے لیکن اس زمانے میں فرانس میں یہ قانون تھا کہ کاشتکار اپنی پیداوار کو ملک سے باہر بغیر ڈیوٹی کے نہیں بھیج سکتے اور فروخت کر سکتے تھے۔ اس پابندی کو ہٹانے کا خیال انہیں مکمل حریت کے خیال کی طرف کے گیا۔ فزیوکریٹس کے ایک ممبر مرسیر دی لاریویئر نے انکے خیالات کی بہت عمدہ وضاہت کرتے ہوئے یہ دلیل دی کہ جائداد کے حقوق کا فائدہ اٹھانے کیلئے مکمل آزادی ضروری ہے:

''نجی جائداد کے حق کے پورے استعمال کے لئے مکمل آزادی ایک بنیادی شرط ہے کیونکہ مکمل آزادی کے بغیر اچھی اور وسیع پیداوار کا تصور ہی بے معنی ہے۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ایک حق جس کے استعمال کرنے کی آزادی نہ ہو حق ہی نہیں ہے؟ اس لیے جائیداد کا تصور بھی آزادی کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ آدمی اس وقت تک کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتا جب تک اس کو اس سے فائدہ اٹھانے اور استعمال کا پورا پورا حق نہ ہو۔ فائدہ اٹھانے اور استعمال کرنے کی آرزو بے معنی ہو جاتی ہے اگر ہم سے ان چیزوں سے فائدہ اٹھانے اور استعمال کرنے کی آزادی چھین لی جائے۔''

اسی طرح فزیوکریٹس کے نزدیک صرف زراعت ہی وہ خام مال پیدا کرتی ہے جو صنعت اور تجارت میں کھپتا ہے چنانچہ خود ایڈم سمتھ اس کے بارے میں لکھتا ہے۔

''یہ نظام اپنی ناتمامیوں کے باوجود حقیقت سے قریب تر ہے۔ اس سے پہلے اب تک اقتصادیات پر جو کچھ چھپ چکا ہے اس میں یہ نظریہ سب سے بہتر ہے۔ اگرچہ اس نظریئے میں اس محنت کی ترجمان جو زمین پر پیدا کرنے والی محنت کی حیثیت سے صرف کی جاتی ہے پوری طرح نہیں کی گئی لیکن قومی دولت کے باب میں فزیوکریٹس کا یہ خیال کہ قوم کی دولت نا قابل استعمال سونے چاندی کے ڈھیر نہیں ہیں بلکہ وہ قابل استعمال چیزیں ہیں جو ہر سال بار بار سماج کی محنت سے پیدا ہوتی رہتی ہیں اپنی جگہ پر درست ہے مکمل آزادی کی حمایت اس حیثیت سے کہ یہی ایک چیز انسان کے حوصلے کو سالانہ پیداوار کے لئے آمادہ کر سکتی ہے بالکل صحیح ہے۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر فزیوکریٹس کے نظریئے کی تعلیمات ہر حیثیت سے منصفانہ، فیاضانہ اور آزاد معلوم ہوتی ہیں''

گو یہ حقیقت ہے کہ فزیوکریٹس نے ایڈم سمتھ کی تعلیمات اور افکار کے عام سے ہونے

سے کافی پہلے مکمل آزادی کی تبلیغ شروع کر دی تھی لیکن دراصل اس دور کے یورپی معاشرے پر جس مفکر کا سب سے زیادہ اثر پڑا وہ ایڈم سمتھ تھا۔اس کی کتاب ''قوموں کی دولت'' کے کئی ایڈیشن ،اور کئی زبانوں میں شائع ہوئے۔

ایک اور بات جس پر ایڈم سمتھ نے زور دیا وہ تقسیم کار ہے یعنی divison of labour وہ اس نظریئے سے وہی مراد لیتا تھا جیسے آج ہم لیتے ہیں ۔یعنی مہارت خصوصی یا سپشلائزیشن۔اس کی مراد یہ تھی کہ ایک آدمی کے ایک خاص کام میں لگائے رکھنے سے اسے اس کام میں خاص مہارت اور تجربہ حاصل ہو جاتا ہے اور یہ تجربہ اور مہارت وقت بچاتی ہے اور کارکردگی میں پھرتی بڑھاتی ہے۔اس سے محنت کی بارآوری میں معتد بہ اضافہ ہوتا ہے اور بالاخر یہ تقسیم کار کا اصول جو مہارت پیدا کرتا ہے وہ ایک طرف بازار کی وسعت پر اثر انداز ہوتا ہے تو دوسری طرف بازار کی وسعت بھی مہارت اور تقسیم کار کے عمل کو تیز کرنے کا موجب ہوتی ہے۔ایڈم سمتھ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ صنعتکاری میں حکومتوں کی مداخلت کا زبردست مخالف اور صنعت کار کی آزادی کا زبردست مبلغ تھا۔چنانچہ اس ضمن میں وہ لکھتا ہے:

> ''ہر وہ نظام جو کچھ خاص صنعتوں کی حوصلہ افزائی کیلئے سرمایہ کے ایک بڑے حصے کو ،جو عام حالات میں اس صنعت کی طرف نہ جاتا ،اس کی طرف منتقل کرتا ہے ،یا خاص احکام امتناعی کے ذریعے سرمایہ کو ایک خاص صنعت میں جانے سے روکتا ہے ،حالانکہ عام حالات میں وہ سرمایہ اسی صنعت کی طرف از خود راغب ہوتا ، یہ پورا عمل ترقی اور صنعت کاری کی راہ میں سنگ گراں ہے۔اگر یہ ترجیحی اور امتناعی نظام ہمیشہ کے لئے بالکل ختم کر دیا جائے تو قدرتی آزادی کا سیدھا سادا نظام خود بخود اس کی جگہ لے لے گا۔ہر شخص جب تک وہ عدل وانصاف کے قوانین میں مخل نہ ہو بالکل آزاد ہے کہ جس طرح چاہے اپنے مفاد کے لئے اپنے طرز پر جدوجہد کرے اور اپنی صناعی اور سرمائے سے دوسرے لوگوں یا جماعتوں کا مقابلہ کرے۔''

یہ تھے وہ افکار جنہوں نے اس زمانے میں جب تاجر اور صنعت کار بے پناہ پابندیاں سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہا تھا صور اسرافیل کا کام کیا اور ایڈم سمتھ آزاد تجارت کا پیغامبر کہلایا اور اس کی کتاب صحیفہ آسمانی ٹھہری۔

MashalBooks.com

13

پرانے نظام کا خاتمہ

ٹیکسوں کی ادائیگی سے گریز آج کوئی ہماری تیسری نیا کا ہی مرض نہیں بلکہ یہ مرض موجودہ ترقی یافتہ ممالک میں آج سے کئی صدیاں پہلے بھی موجود تھا۔ اٹھارہویں صدی کے فرانسیسی معاشرے کے مراعات یافتہ طبقہ نے خود تسلیم کیا تھا کہ وہ عملی طور پر محصول سے مستثنیٰ تھے۔ ارباب کلیسا اور طبقہ امرا برملا یہ اعلان کیا کرتے تھے کہ ''اگر ان پر بھی ویسے ہی محصول عائد کئے گئے جیسے عوام پر کئے جاتے ہیں تو فرانس بالکل تباہ ہو جائے گا۔'' لیکن کسی بھی دور میں زیادہ مدت تک یہ صورت حال قائم نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ اٹھارویں صدی میں جب فرانس کی مالی حالت ناگفتہ بہ ہونے لگی تو 1776 میں فرانس کے مشہور عالم اور وزیر خزانہ تو گو رنے اس سلسلے میں اصلاحات کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن امرا اور اہل کلیسا تھے جو ان اصلاحات کی راہ میں دیوار بن گئے۔ انہوں نے پارلیمنٹ کو گھیر لیا اور صاف صاف الفاظ میں ان اصلاحات کے خلاف حکومت کی طرف سے فرمان کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ ان مراعات یافتہ طبقوں کی حفاظت کے لئے حکومت کو باقاعدہ اعلان کرنا پڑا جس میں کہا گیا:

''انصاف کا سب سے پہلا اصول ہے کہ کسی شخص سے وہ چیزیں نہ چھینی جائیں جو اس کی ملکیت ہیں۔ اس قاعدے میں صرف جائیدادیں ہی نہیں آتی ہیں بلکہ وہ

حقوق بھی آتے ہیں جو کسی شخص کو اپنی پیدائش اور حیثیت کی وجہ سے حاصل ہیں۔ ہر وہ نظام جو انصاف اور نیکی کی آڑ میں مساوات پیدا کرنا چاہتا ہے اور تمام طبقاتی امتیازات کے خاتمے کا خواہاں ہے وہ اصل میں بدامنی پیدا کرنا چاہتا ہے کیونکہ مساوات ہی بدامنی کو جنم دیتی ہے۔ فرانسیسی شہنشاہت اپنے دستور کے مطابق چند ممتاز طبقوں پر مشتمل ہے۔ ارباب کلیسا کے سپرد تعلیمی اور مذہبی خدمات ہیں، امرا حکومت کی حفاظت کے لئے اپنی جانیں وقف کر چکے ہیں، نیچے کا طبقہ جو بادشاہ کی خدمت کسی امتیازی فرض کی بجا آوری سے نہیں کرتا وہ اپنی کاریگری اور محنت سے ہی یہ خدمات بجالاتا ہے۔ اس لئے ان امتیازات کو مٹانا فرانسیسی دستور کی دھجیاں اڑانا ہے۔''

فرانس میں ارباب کلیسا اور امر کے طبقے امتیازی حقوق کے مالک تھے۔ یہ دونوں طبقے بالترتیب پہلی اور دوسری جماعتیں (first and second estates) کہلاتے تھے۔ ارباب کلیسا کی مجموعی تعداد ایک لاکھ 30 ہزار افراد پر مشتمل تھی اور طبقہ امرا کی تعداد ایک لاکھ 20 ہزار تھی۔ ان میں بھی تفاوت تھا لیکن قدر مشترک یہی تھی کہ یہ کوئی کام اور محنت نہیں کرتے تھے۔ عوام ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتے تھے جن کو کوئی حق حاصل نہ تھا۔ وہ تیسری جماعت (third estate) کہلاتے تھے اور وہ ڈھائی کروڑ تھے۔ گویا آبادی کا 95 فیصد۔ حکمران اور مراعات یافتہ حکمراں طبقوں کی تمام عیاشیوں اور مسرفانہ عادتوں کا بوجھ انہی 95 فیصد غریب عوام کو برداشت کرنا پڑتا لیکن پھر بھی اس زمانے میں کسان تمام محصولات اور بیگاروں کی ادائیگی کے بعد کچھ نہ کچھ پس انداز کر لیتا تھا اور اس سے زمین خرید لیتا تھا۔ یہاں تک کہ 1789 میں جب فرانس میں زبردست انقلاب برپا ہوا تو فرانس کی تقریباً ایک تہائی زمین کاشتکار کسانوں کی ملکیت تھی۔ لیکن اس صورت حال کے باعث وہ اور بھی بے چین اور غیر مطمئن تھے۔ یہ کیونکر ہوا؟ وجہ یہ ہے کہ کسان ہمیشہ زمین کا بھوکا رہا ہے۔ تھوڑی سی زمین کی ملکیت نے ان کی زمین حاصل کرنے کی خواہش پر آگ پر تیل کا کام کیا۔ لیکن حکومت کے لگائے ہوئے لگان اور محصول ان کی آمدنی کا 80 فیصد حصہ کھا جاتے تھے۔ اب ان کی یہ آرزو تھی کہ کسی طرح لگانوں اور محصولوں سے چھٹکارا ملے۔ یہی آرزو اٹھارویں صدی میں یورپ کے دوسرے ممالک کے کسانوں کو بھی پریشانی کر رہی تھی۔ اس وجہ سے جگہ جگہ کسانوں کی بغاوتیں ہو رہی تھیں۔ ان بغاوتوں میں کامیابی نے

کسان طبقے کا شعور بڑھایا، لیکن وہ خود چونکہ ان پڑھ تھے اور ریاست کے معاملات کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے انہیں ایسے عناصر کی ضرورت محسوس ہوئی جو ان کی جدوجہد کی قیادت کر سکیں۔ یہ ضرورت فرانس میں ابھرتے ہوئے متوسط طبقے نے پوری کر دی۔

یہ ابھرتا ہوا متوسط طبقہ بورژوازی (bourgeoisie) تھا جس نے فرانس میں انقلاب برپا کیا اور انقلاب سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھایا۔ اس طبقے کے لئے انقلاب کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اگر یہ طبقہ اس وقت کے ڈھانچے کو توڑنے اور تباہ کرنے میں کامیاب نہ ہوتا تو حکمران طبقے خود اس کو اکھاڑ پھینکتے۔ مگر آخر یہ بورژوا لوگ کون تھے؟ یہ اہل قلم، ڈاکٹر، استاد، وکیل، جج، سرکاری ملازم اور عام پڑھے لکھے لوگ تھے اس طبقے میں تاجر، کارخانوں کے مالک، بینکر اور دوسرے روپئے والے لوگ بھی تھے جو نہ صرف دولت رکھتے تھے بلکہ مزید دولت پیدا کرنے کے خواہش مند تھے یہ سب لوگ اپنی پرانی زندگی جو جاگیرداری سماج کی سوچ اور کلیسا کی تنگ نظری اور توہم پرستی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی، اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ تمام پابندیاں اب ان کے لیے ناقابل برداشتہ ہوگئی تھیں۔ اب وہ جاگیرداری کا تنگ اور پیوست زدہ لباس اتار کر سرمایہ داری نظام کا ڈھیلا ڈھالا لباس زیب تن کرنا چاہتے تھے۔ انہیں اپنے معاشی ضروریات کی ترجمانی فزیوکریٹس اور ایڈسمتھ کی تحریروں میں ملی، اور سماجی ضروریات کی والیتر اور انسائیکلوپیڈسٹ فلسفیوں کی تحریروں میں۔ ''ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو'' کا نعرہ صنعت و تجارت کی دُنیا سے نکل کر عقلیات، مذہب اور سائنس کی دُنیا کو بھی متاثر کرنے لگا تھا۔

بورژوا طبقے کی مالی حالت اس زمانے میں بہت اچھی تھی۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ ان کی مالی برتری کے برابر سیاسی وقار اور اختیار بھی حاصل ہو۔ وہ اپنی ملکیت کا تحفظ بھی چاہتے تھے تاکہ یہ جاگیرداری نظام کی دست درازیوں سے محفوظ رہے۔ فرانس کے حالات میں جو ابتری پیدا ہوگئی تھی اس نے پرانے انداز سے حکومت کا چلانا اب قریب قریب ناممکن کر دیا تھا اور اب خود فرانس کے حکمراں طبقے کے کئی افراد بھی اس نئی حقیقت کو تسلیم کرنے لگے تھے۔ چنانچہ کونتے دی کلون Contede Calonne نے جو وزارت خزانہ کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھا ان آنے والے طوفانوں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا:

''کلیسا اور امرا کے خصوصی حقوق نے حکومت کا توازن بگاڑ دیا ہے اور اب یہاں یہ ممکن نہیں رہا ہے کہ مشترک ارادے اور مشترک مقصد سے حکومت کا نظام چلایا جا سکے۔ اس میں کوئی

شک نہیں کہ ہماری مملکت ایک ناقص بادشاہت ہے جس میں خرابیاں بھری ہوئی ہیں اور جس پر موجودہ حالات میں حکومت کرنا ناممکن ہوگیا ہے''

یہ انتباہ جو ایک اعلیٰ سرکاری عہدہ دار کررہا تھا سچ نکلا۔ عوام کی بے چینی اور ایک ذہین ابھرتے ہوئے طبقے نے مل کر پرانے نظام کو الٹ دیا۔ یہ انقلاب 1789 میں برپا ہوا اور تاریخ میں انقلاب فرانس کے نام سے مشہور ہوا۔

اس انقلاب کے مقاصد انقلابیوں کے ایک لیڈر ایبے سین (Abbe, Sieyes) نے نہایت سادگی سے اپنے ایک پمفلٹ میں پیش کئے جس کا عنوان تھا۔

''تیسرا طبقہ کیا ہے؟''

''ہمیں اپنے آپ سے تین سوال پوچھنا چاہئیں:

پہلا: تیسرا طبقہ کیا ہے؟ ..... سب کچھ

دوسرا: اب تک سیاسی نظام میں اس کا کیا مقام رہا ہے؟ ..... کچھ نہیں

تیسرا: وہ کیا چاہتا ہے؟ ..... کچھ بننا چاہتا ہے۔''

لیکن حقیقت یہ ہے کہ گو انقلابیوں میں دستکار، کسان اور بورژوا شامل تھے اور دستکاروں اور کسانوں نے ہی لڑ بھڑ کر انقلاب کو کامیاب بنایا، لیکن انقلاب کا پھل زیادہ تر بورژوا طبقے کے ہاتھ لگا۔ انقلاب کے دوران اس طبقے نے دولت بٹورنے اور طاقت پر قبضہ کرنے کے بہت سے طریقے نکالے اور ان سے بہت فائدے اُٹھائے اُنہوں نے امرا اور کلیسا سے چھینی ہوئی زرعی اور شہری اراضی پر سٹہ بزی کر کے خوب دولت کمائی اور فوج کے جعلی ٹھیکوں سے جی بھر کر اپنے گھر بھرے۔

ایک مزدور لیڈر مارے (Marat) نے ان انقلاب کے دنوں کا نقشہ کھینچا ہے وہ لکھتا ہے:

''انقلاب کی گھڑیوں میں عوام نے اپنی عددی طاقت سے تمام دشواریوں کو راہ سے ہٹا دیا اور زبردستی اپنا راستہ بنایا۔ اُنہوں نے شروع میں کتنی ہی کامیابی حاصل کر لی ہو آخر میں ان کو اوپر کے طبقوں کے منصوبہ بند، ہوشیار اور مکار لوگوں نے اپنی چالوں سے بری طرح شکست دے دی۔ اوپر کے طبقے کے پڑھے لکھے لوگوں نے جو پہلے جاگیرداروں کی مخالفت کر رہے تھے اپنی باریک چالوں سے اپنا کام بنالیا

اور غریبوں کے مخالف ہو گئے۔ پہلے اُنہوں نے عوام کے دلوں میں جس طرح بن پڑا گھر کر کے ان کی اجتماعی طاقت سے فائدہ اُٹھایا، لیکن انقلاب کے کامیاب ہوتے ہی امرا کی جگہ خود براجمان ہو بیٹھے۔ انقلاب سماج کے پسماندہ طبقوں، مزدوروں کسانوں، دستکاروں، چھوٹے دکانداروں اور ادنیٰ جماعت کے لوگوں نے شروع کیا تھا اور اُنہوں نے اس انقلاب کو کامیاب بنایا۔ لیکن انقلاب کو کامیاب بنانے والے یہی وہ لوگ ہیں جن کو بورژوا طبقہ، جس نے اس انقلاب کو ہائی چیک کر لیا، اب بے شرم اور رزیل کہہ پکارتے ہیں اور بے حیائی سے ادنیٰ ترین طبقہ ''پرولتاری'' کہتے ہیں۔ اپنی جس بدنیتی کو یہ اوپر کے لوگ چھپائے ہوئے تھے وہی پوری ہو کر رہی اور یہ انقلاب ان زمینوں کے مالکوں، وکیلوں اور جعل سازوں کے نفع کی چیز بن کر ختم ہو گیا۔''

چنانچہ انقلاب فرانس کے ذریعے بورژوا طبقے نے فرانس میں سیاسی اقتدار حاصل کر لیا۔ یہ درست ہے کہ اس انقلاب نے جاگیرداروں کے نسلی امتیازات اور برتری کو ختم کر ڈالا لیکن اب اس کی جگہ تجارتی امتیاز نے لے لی۔ آزادی، مساوات اور برادری کے مسحور کن نعرے جو انقلاب کے دوران ہر انقلاب پسند کی زبان پر تھے وہ سب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ بورژوا طبقے نے انقلاب سے جو مفادات حاصل کئے ان کو مستحکم کرنے کے لیے نپولین کے لیے زمین ہموار کی۔ نپولین کے مجموعہ قوانین کے مطالعہ سے مذکورہ بالا حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اس مجموعہ قوانین کا مقصد اس کے سوا کچھ اور معلوم نہیں ہوتا کہ بورژوا طبقے کے کاروبار، املاک اور مفادات کی حفاظت کی جائے۔ اس مجموعہ قوانین میں 2 ہزار دفعات ہیں لیکن ان میں سے صرف سات دفعات مزدوروں سے متعلق ہیں اور تقریباً 8 سو دفعات جائیدادوں اور کاروبار کے تحفظ سے متعلق ہیں۔ اس پورے مجموعہ قوانین میں مزدوروں کی ٹریڈ یونینوں اور ہڑتالوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی، بلکہ ان کو سرے سے ہی ممنوع قرار دے دیا گیا۔ لیکن اس کے مقابلے میں مالکوں کی انجمنوں کی بدستور اجازت دی گئی۔ ان تنازعوں میں جو مالک اور مزدور کے درمیان معاوضے اور اجرت کے متعلق عدالتوں میں پیش ہوں ان میں عدالتوں کو ہدایت دی گئی کہ صرف مالک کے بیان پر بھروسہ کیا جائے۔

جب طوفان کے بادل چھٹے اور لڑائی کا میدان صاف ہوا تو نظر آیا کہ بورژوا طبقہ کو مکمل فتح

حاصل ہوگئی ہے اور اس نے جاگیردار طبقے کو شکست دے کر اپنے لئے خرید نے اور فروخت کرنے کا حق حاصل کرلیا ہے۔ اب وہ پوری طرح آزاد تھا کہ جو کچھ چاہتا خریدتا جہاں چاہتا خریدتا اور جہاں چاہتا فروخت کرتا۔ اس پر اب کوئی پابندی نہیں تھی۔ بہر حال یہ ضرور ہوا کہ اس انقلاب نے نپولین کو جنم دے کر نہ صرف فرانس میں بلکہ پورے یورپ میں ایک حد تک جاگیرداری نظام کا جنازہ نکال دیا۔ ہر ملک جہاں سے نپولین کی فوجیں گذریں وہاں جاگیرداری نظام تہس نہس ہوگیا۔ نپولین کی فوجیں آگے بڑھتی گئیں اور اپنے پیچھے آزاد تجارت اور بے لگام بازار کے دروازے کھولتی گئیں،۔

کارل مارکس (Karl Marx) نے 1852 میں انقلاب فرانس کے بارے میں بے حد دلچسپ تبصرہ قلمبند کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

''دیمولیں (Desmoulins) واں تون (Danton) روبس پیئر (Robespierre) سین ژوس (Saint.just) نپولین اور ان مشاہیر اور فلسفیوں نے فرانس کی دوسری زبردست انقلاب پسند جماعتوں کے دوش بدوش اپنی زندگی کی مہم جیت لی۔ یہ مہم بورژوا طبقے کی آزادی اور جدید بورژوا سماج کے قیام کے سوا کچھ اور نہ تھی۔ جمہوریت پسندوں نے جو اپنی فطرت میں انتہا پسند تھے جاگیرداری نظام کی جڑوں کو بنیاد سے اکھاڑ پھینکا اور جاگیردارانہ نظام کی مقتدر ہستیوں کے سر قلم کرکے رکھ دیئے۔ نپولین نے پورے فرانس میں ایسے حالات پیدا کردیئے جن میں آزاد مقابلے کی ترقی کے لئے گنجائش نکل آئی، جاگیروں کی تقسیم کے بعد زمین کی جائیداد سے پوری طرح فائدہ اُٹھانے کے امکانات پیدا ہوگئے۔ اور قوم کو اپنی صنعتی صلاحیتوں کے استعمال کا اور اپنی صنعتی پیداوار بڑھانے کا پورا موقع ملا۔ سرحدوں کے آر پار ہر جگہ نپولین نے جاگیرداری نظام کے ہر ادارے سے صفایا کردیا۔''

انقلابات اکثر و بیشتر خونی ہوتے ہیں۔ ایک عالم فرانس کے انقلاب کی خوں خواری اور دہشت انگیزی پر دھچکے میں آگیا تھا۔ انقلاب فرانس کے سب سے شدید دُشمن انگریز تھے۔ یہ تاریخ ایک بڑی ہی دلچسپ حقیقت ہے۔ انگریز یہ بھول گئے تھے کہ ان کے بورژوا طبقے نے سو برس پہلے اپنے سیاسی حقوق اور اقتصادی مساوات حاصل کرنے کے لیے ایسا ہی انقلاب بپا کیا

تھا۔ انگریز یہ بھی بھول گئے تھے کہ ان کے انقلاب کے جلو میں بھی ایسی ہی خونریزی اور دہشت گردی آئی تھی۔ لیکن فرانس اور انگلستان کے انقلابوں میں ایک فرق بھی تھا۔ فرانس میں تجارتی طبقے نے پیدائشی جاگیردار طبقے پر بہت ہی کاری ضرب لگائی تھی، ایسی کاری ضرب جس سے یہ طبقہ قریب قریب ختم ہوگیا۔ انگلستان میں بھی تاجر طبقے نے فتح حاصل کی لیکن وہاں جاگیردار طبقے کو جسمانی طور پر ختم کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انگلستان کا تاجر طبقہ اور جاگیردار دونوں ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف تھے، اسلئے اُنہوں نے ایک لحاظ سے پرا من طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس طرح سے انگریز، تاجر، طبقے نے جاگیرداروں پر آخری کاری ضرب لگائے بغیر ہی ان پر بالادستی حاصل کرلی، جبکہ یورپ کے دوسرے ملکوں میں یہ عمل نہ دہرایا جاسکا۔ انگستان بورژوا طبقے نے جاگیرداروں کی نوابانہ شان حاصل کرلی اور جاگیرداروں نے اپنی ''شرافت'' کو خیر باد کہہ کر تجارت میں حصہ لینا شروع کردیا۔ لیکن اس کے باوجود انگلستان کی تاریخ میں 1960 سے 1988 تک زمانہ خاصا ہنگامہ پرور زمانہ رہا ہے اور یہ ہنگامے اسی وقت ختم ہوئے جب انگریز بورژوا طبقے نے حکومت میں ایک حد تک بالادستی حاصل نہ کرلی۔ اس کا سب سے بڑا گواہ خود ایڈمنڈ برک (Edmund Burke) تھا۔ یہ وہی انگلستانی پارلیمنٹیرین تھا جس نے بڑی قابلیت کے ساتھ امریکی نوآبادی کے باشندوں کی حمایت کی تھی اور کہا تھا کہ پوری نمائندگی کے بغیر ان پر ٹیکس عائد کرنا ناجائز ہے۔

لیکن جب فرانس میں انقلاب بپا ہوا تو ایڈمنڈ برک نے فرانسیسی انقلاب پسندوں پر کڑی نکتہ چینی کی۔ اسوقت انگلستان کے ہی ایک عالم نے برک کو انگلستان کے سو سال پہلے والے انقلاب کو یاد دلاتے ہوئے کہا:

> ''مردانگی، شرافت اور انسانیت کے نام پر صاف صاف بتاؤ کہ فرانس کے باشندوں نے اس ملک کے خلاف کونسا ناقابل معافی جرم اور ناقابل تلافی گناہ کیا ہے؟ اُنہوں نے 1789 کے انقلاب کے ذریعے اپنے ملک کی حکومت بدل دی ہے۔ کیا یہ کوئی گناہ ہے؟ وہ ہم سے اس معاملہ میں صرف اتنا مختلف ہیں کہ اُنہوں نے یہ قدم ہم سے سو سال کے بعد اُٹھایا ہے۔ انگریزی قوم نے اپنے شہنشاہ کی گردن پر چھری چلا کر مثال پہلے ہی قائم کردی تھی۔''

MashalBooks.com

بازار کی آزادی کی لڑائی انگلستان میں 1689 میں اور فرانس میں 1789 میں لڑی گئی اور دونوں جگہ متوسط طبقوں کی فتح کی شکل میں ختم ہوئی۔ 1789 میں انقلاب فرانس نے جاگیرداری نظام کو ختم کر کے قرون وسطیٰ کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ قرون وسطیٰ کے پروہت، جنگ آزما، محنت کش طبقوں نے ٹوٹ پھوٹ کر ایک نئے درمیانی طبقے (middle Class) کو جنم دے دیا۔ یہ طبقہ سالہا سال سے اقتدار حاصل کرنے کے لئے مصروف جہد تھا اور اب تک جاگیرداری نظام کے خلاف تین فیصلہ کن لڑائیاں لڑ چکا تھا۔ پہلی لڑائی عیسائیت کی تجدید و اصلاح (پروٹسٹنٹ ریفرمیشن) کی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی، دوسری انگلستان کے عظیم الشان انقلاب کے نام سے شہرت پا چکی ہے، تیسری لڑائی انقلاب فرانس کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔

انقلاب فرانس کے بعد قدیم جاگیرداری نظام کی جگہ ایک نئے سماج نے آنکھ کھولی۔ اس سماج کی بنیاد بورژوا طبقے نے آزاد تجارت کے میدان میں رکھی تا کہ آئندہ نفع کمانے میں کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہو۔ یہ نظام سرمایہ داری (capitalism) کے نام سے موسوم ہوا۔

تصویر نمبر 1
صفحہ نمبر 127

MashalBooks.com

پندرھویں صدی میں جنوبی امریکہ کو فتح کرنے کے لیے انتہائی ظلم ڈھائے گئے۔ یہاں ہسپانوی جنرل بلبوآ مقامی لوگوں کو کتوں کو کھلا رہا ہے۔

تصویر نمبر2
صفحہ نمبر128

اٹھارویں صدی انگلستان میں فیکٹریوں کی ایجاد ہوتی ہے۔ یہاں مزدوری کرنے والوں میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔

تصویر نمبر3
صفحہ نمبر128

MashalBooks.com

فیکٹریوں میں کام کرنے کیلئے بچے کرائے پر لئے جارہے ہیں۔ ریل گاڑیاں بھی اسی زمانہ میں ایجاد ہوئیں۔

14

سرمایہ داری نظام اپنے قدم جماتا ہے

سرمایہ داری نظام کے سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ''سرمایہ'' کیا ہوتا ہے۔ عام طور پر لوگ سرمایہ اور دولت کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں، لیکن معاشیات کی سائنس میں ایسا نہیں ہے۔ اس کو سمجھنے کیلئے روزمرہ کی زندگی سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ فرض کیجئے سینما ہاؤس کے باہر دو دوست فلم کے ٹکٹ خریدنے کے لیے ایک قطار میں کھڑے ہیں۔ ایک دوست دوسرے سے کہتا ہے کہ تم میرے لئے دو ٹکٹ خرید لو اور ایک اپنے لئے۔ وہ اس کو ان تینوں ٹکٹوں کے پیسے دیتا ہے اور خود بھی قطار میں کھڑے ہو کر تین ٹکٹ خرید لیتا ہے۔ اس طرح اس کے پاس تین اپنے اور دو ٹکٹ جو اس نے اپنے دوست کے ذریعہ خریدے، کل پانچ ٹکٹ ہو گئے۔ ایک اس نے اپنے لئے رکھ لیا۔ لیکن فلم شروع ہونے سے پہلے اس نے چار ٹکٹ آواز لگا کر منافع پر یا بلیک میں فروخت کر دیئے۔ اس طرح اس کے پاس جو رقم تھی وہ سرمایہ میں تبدیل ہو گئی۔

دولت یا روپیہ اس وقت سرمایہ بنتا ہے جب اس سے کوئی چیز نفع کمانے کی غرض سے خریدی جاتی ہے۔ اس شخص نے سینما کے ٹکٹ منافع کمانے کی غرض سے خریدے تھے اس لئے جو روپیہ اس میں لگایا (جس میں خود اس کے اور اس کے دوست کے ٹکٹ کی قیمت بھی شامل ہے) وہ سرمایہ تھا۔ اسی طرح جب کسان کپاس کی فصل بیچتا ہے۔ اور اس آمدنی سے اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ بھرتا ہے تو یہ آمدنی سرمایہ نہیں ہوتی۔ لیکن مل والے کے لیے وہی روپیہ جو اس نے

کسان کو دیا سرمایہ ہے کیونکہ وہ کپاس سے دھاگہ بنا کر منافع کمائے گا۔

اب یہ غور کیجئے کہ ایک سرمایہ دار سب سے اہم کونسی چیز خریدتا ہے جو دراصل اس کے منافع کی بنیاد ہے۔ کیا یہ سینما کے ٹکٹ ہیں؟ کپاس ہے؟ موٹر کاریں ہیں؟ گھر ہیں؟ نہیں وہ چیز ان میں سے کوئی بھی نہیں لیکن اس سب کا حصہ ہے۔ وہ چیز ہے محنت کسان کی یا مزدور کی لیبر پاور۔ سرمایہ دار مزدور کی لیبر پاور خریدتا ہے اور اس کے عوض وہ اسے اجرت دیتا ہے۔ (جیسے ایک دوست نے دوسرے دوست کی مدد خریدنے کیلئے اس سینما کے ٹکٹ کے پیسے دیئے) لیکن ظاہر ہے صنعت کار یہ لیبر خرید کر خود اس محنت کو بازار میں نہیں بیچتا۔ جو چیز وہ بیچتا ہے، اور منافع سے، وہ ہے وہ سامان جو مزدور نے خام مال پر کام کر کے مصنوعات میں تبدیل کیا۔ سرمایہ دار کا منافع نکلتا ہے۔ اس طرح کہ مزدور نے اپنے کام سے مال کی جو قیمت بڑھائی (آجکل اس کو ''ویلیو ایڈیڈ Value.added) کہتے ہیں۔ اسے اس کا بہت چھوٹا حصہ اجرت کی شکل میں ملتا ہے، بڑا حصہ سرمایہ دار کو پہنچتا ہے۔

سرمایہ دار جن چیزوں کا مالک ہوتا ہے ..... مثلاً عمارتیں، مشینری، خام مال وغیرہ..... انہیں ذرائع پیداوار کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ لیبر پاور خریدتا ہے (جس کا مالک مزدور ہوتا ہے) جب ذرائع پیداوار اور لیبر پاور کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا جاتا ہے تو سرمایہ داری پروڈکشن کی شروعات ہوتی ہے۔

موجودہ زمانے میں صنعتی کارخانہ قائم ہوتے ہی صنعت کار سرمایہ اکٹھا کر لیتا ہے بلکہ اب تو جدید ترین دور میں وہ کمپنی کے حصص کی فروختگی کے ساتھ ہی سرمایہ اکٹھا کر لیتا ہے۔ لیکن اس ضمن میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ موجودہ دور سے پہلے سرمایہ کہاں سے آتا تھا؟ کہا جاتا ہے کہ پرانے زمانے میں لوگ پائی پائی جمع کر کے روپیہ جمع کرتے اور اس کو صنعت میں لگا دیتے تھے۔ یہ ایک حد تک سچ ہوسکتا ہے لیکن اس سے سرمایہ داری نظام کی بنیاد نہیں اُٹھائی جاسکتی تھی۔ دراصل سرمایہ داری نظام نے تجارت کے بطن سے جنم لیا ہے اور تجارت سے مراد صرف چیزوں کا تبادلہ ہی نہیں۔ اس تجارت کے لفظ کے پیچھے ایک دُنیا چھپی ہوئی ہے جس میں چوری، ڈکیتی، بلیک مارکیٹ، سمگلنگ، منشیات کی فروخت سبھی شامل ہیں۔ کیا ایسٹ انڈیا کمپنی نے افیون کی تجارت نہیں کی تھی؟ کیا ایسٹ انڈیا کمپنی نے باقاعدہ سمگلنگ اور ڈاکہ زنی کو روا نہیں رکھا تھا؟ سپین کی شہری حکومتوں نے صلیبی جنگوں میں مغربی یورپ سے بلاوجہ امداد طلب نہیں کی

تھی۔ یہ تمام مذہبی لڑائیاں دراصل تجارتی ضرورتوں کے تحت ہی لڑی گئی تھیں۔ ان مذہبی لڑائیوں میں فتح حاصل کرنے کے بعد اطالوی فاتحین نے مال غنیمت سے اپنے گھر بھر لئے، اور اس طرح دولت مشرقی ممالک سے نکل کر اطالوی تاجروں اور مہاجنوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ جون ہوبسن اس تجارت کے متعلق لکھتا ہے:

''اس طرح بہت پہلے نفع بخش تجارت کی بنیاد رکھی گئی۔ اس تجارت نے مغربی یورپ میں دولت کے انبار لگا دیئے اور اس طرح وہ ضروری سرمایہ اکٹھا ہو گیا جو آگے چل کر ان ملکوں میں سرمایہ دارانہ پیداوار کا موجب بنا۔''

مشرق سے جو دولت آئی تھی وہ اگرچہ بہت تھی لیکن پھر بھی کافی نہ تھی۔ سرمایہ داری دور کی ابتداء سے پہلے بے شمار سرمایہ کے اکٹھا کرنے کا زیادہ کام سولہویں صدی میں کیا گیا۔ کارل مارکس نے جو موجودہ سرمایہ داری نظام کے تدریجی ارتقا کے موضوع پر بڑے محققین میں سے ایک ہے، لکھا ہے۔

''امریکہ میں سونے اور چاندی کی دریافت، دیسی آبادی کی تباہی، زبردستی غلام بنانے کی مہم، قدیم دیسی باشندوں کی امریکی کانوں میں تدفین، ہندوستان اور ویسٹ انڈیز پر فاتحانہ یلغار اور ان کی لوٹ کھسوٹ اور افریقہ کے براعظم کا کالی چمڑی کے لوگوں کی تجارت کیلئے شکارگاہ بننا، یہ وہ بنیادیں تھیں جن پر سرمایہ دارنہ نظام کے دور جدید کی عمارت کھڑی کی گئی۔''

سرمایہ داری کی نشوونما اور ارتقا میں جن مظالم کا ہاتھ ہے اور ہر دور میں ان کے متعلق پڑھ کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر انگلستان کے پروفیسر ایچ میری ویل نے 1840 میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں لیکچروں کا ایک سلسلہ ''نوابادیات اور نوابادکاری'' کے عنوان سے شروع کیا تھا۔ ایک لیکچر کے دوران اُنہوں نے ایک سوال اُٹھایا اور خود ہی اس کا جواب دیتے ہوئے بتایا:

''لیورپول اور مانچسٹر جو معمولی قصبوں کی حیثیت رکھتے تھے کیوں اتنے بڑے اور عظیم الشان شہر بن گئے؟ کیا چیز ان کی ہمیشہ جاری رہنے والی صنعت کا پیٹ بھرتی رہی اور ان کی تیزی سے بڑھنے والی دولت کا موجب ہوتی رہی؟ ان شہروں کی موجودہ دولت افریقی حبشیوں کی عرق ریزیوں اور تباہ حالیوں کی مرہون منت

ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں حبشیوں کے ہاتھوں نے ان کی بندگار ہیں بنائی ہوں اوران کے بھاپ کے انجنوں کو بنایا ہو۔''

اور پھر جب جب روشن خیالی کی ہوائیں انگلستان میں چلنی شروع ہوئیں تو برطانوی پارلیمنٹ کے کچھ لبرل اراکین پارلیمنٹ نے حبشیوں کی غلامی کے رواج کے خاتمے پر اصرار کرنا شروع کیا۔ اس کے جواب میں لیورپول کے تاجروں نے 1788 میں پارلیمنٹ کو ایک عرضداشت پیش کی، جس میں کہا گیا تھا:

''یہ درخواست کنندگان اس تحریک کو جو افریقی غلاموں کی خرید وفروخت پر پابندی کے سلسلے میں شروع کی گئی ہے بڑی تشویش اور اضطراب کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ یہ تجارت سالہا سال سے لیورپول کی تجارت کی بڑی وسیع شاخ کی حیثیت سے جاری چلی آرہی ہے۔آپ کے درخواست کنندگان التجا کرتے ہیں کہ اس تجارت پر پابندی عائد کرنے کی کوئی بات نہ سنی جائے۔''

سو یہ تھے وہ طور طریقے اور ظلم وستم جن کے ذریعے تاجروں نے دولت کے انبار جمع کئے۔ بہرحال اس دولت کے بعد بھی سرمایہ دارانہ پیداوار کے لئے ایک کمی باقی تھی، کیونکہ صرف دولت کو سرمایہ کے طور پر استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اکیلا سرمایہ نفع نہیں کما سکتا تاوقتیکہ محنت کشوں کی محنت شامل ہو کر اس کو منافع بخش نہ بنادے۔ اس لئے سرمایہ کی فراہمی کی مہم کو سر کرنے کے بعد بھی محنت کرنے والوں کی معقول تعداد کی ضرورت کو پورا کرنا باقی رہ جاتا تھا۔ اب تک یہ کمی افریقی لوگوں کو غلام بنا کر پوا کی جاتی تھی۔ ضرورت کئی گناہ زیادہ مزدوروں کی تھی۔ یہ ضرورت کاشت کار کو زمین سے بے دخل کر کے اور دست کار کو اس کے اوزاروں سے محروم کر کے پوری کی گئی۔

سولہویں صدی سے انیسویں صدی عیسوی کی ابتداء تک انگلستان میں کسانوں کی بے دخلی کا عمل جاری رہا۔ ڈاکٹر آر۔ پرائس جو اٹھارہویں صدی کا مصنف ہے، لکھتا ہے۔

''جب یہ زمین چھوٹے کسانوں کے ہاتھوں سے نکل کر بڑے کسانوں کے ہاتھ میں آتی ہے تو پھر چھوٹا کسان اس جماعت میں شامل ہوجاتا ہے جو دوسروں کے لیے کام کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔''

یہی حال دست کاروں کا ہوا۔ چنانچہ فلپ گیکل نے 1836 میں اپنی کتاب میں لکھا:

''بھاپ کے انجنوں کے رواج پانے کے بعد دستی پارچہ بافوں کی زندگیوں پر بڑا غیر معمولی اور دردناک اثر پڑا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ بھاپ کے انجنوں نے ان غریبوں کو کچل ڈالا۔''

بہر حال یہ ایسا دور تھا جس میں پیداوار اور مبادلے کے طریقوں میں بڑا انقلابی تغیر ہو گیا تھا۔ ہم اس تغیر کو جاگیرداری نظام کا خاتمہ اور سرمایہ داری عہد کی ابتدا سمجھتے ہیں۔ اب یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ اس تغیر و تبدیلی نے قدیم سائنس، قانون، تعلیم، حکومت اور مذہب پر کیا اثر ڈالا۔ انقلاب اور تبدیلیوں کی زد سے زندگی کے یہ پہلو بھی نہ بچ سکے۔ 1800 میں قانون نے اپنا ڈھانچہ بدل لیا اور اب اس کی شکل وہ نہیں رہ گئی تھی جو 1200 کے یورپ میں تھی۔ مذہبی تعلیمات کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی۔ پروہت اور پادری اور جنگ آزما طبقے بھی اب اپنا پرانا وقار کھو چکے تھے۔ اب سماج پر تاجروں، کارخانہ داروں اور بڑے بڑے بینکروں کی حکومت تھی۔ ان کو بالکل دوسری قسم کی تعلیمات کی ضرورت تھی۔ وہ زمانہ ختم ہو گیا تھا جب صرف اپنے بال بچوں کے لیے روزی پیدا کرنی پڑتی تھی۔ اس زمانے میں چرچ کے لئے یہی مناسب تھا کہ وہ نفع خوری کے خلاف وعظ کہتا۔ لیکن اس بدلے ہوئے زمانے میں جب انسان کا بنیادی مقصد نفع کمانا ٹھہرا چرچ کو بھی اپنا انداز بدلنا پڑا اور اپنے وعظ کے موضوعات میں تبدیلیاں لانی پڑیں،

رومن کیتھولک کلیسا کی نشو ونما قدیم جاگیرداری نظام کے دور میں ہوئی تھی اس نظام میں دست کاروں کو، جولاہوں کو، درزی کو صرف اپنے اور اپنے متعلقین کے لیے روزی پیدا کرنی ہوتی تھی، چنانچہ اس دور میں چرچ منافع کو اور سود کو گناہ سمجھتا تھا۔ رومن کیتھولک کلیسا کی جڑیں پرانے نظام میں اتنی گہری تھیں کہ جب نیا نظام آیا تو وہ اس کا ساتھ نہیں دے سکا۔ نئی ضرورتوں اور زمانے کے نئے تقاضوں نے نئے کلیسا کی ضرورت بھی پیدا کر دی اور رومن کیتھولک کلیسا کی اجارہ داری میں دراڑیں پڑنی شروع ہو گئیں۔ نئی ضرورتوں نے پروٹسٹنٹ چرچ کو جنم دیا، لیکن سرمایہ داری نظام کی ضرورتیں اتنی پیچیدہ اور تہ در تہ تھیں کہ پروٹسٹنٹ چرچ بھی ان تہ در تہ ضرورتوں کی تشفی کیلئے مختلف فرقوں میں تقسیم ہوتا چلا گیا۔ اس طرح پروٹسٹنٹ چرچ کی ہر نئی شاخ اور ہر نیا فرقہ سرمایہ داروں کی روحانی تشفی کی غرض کسی نہ کسی صورت میں پوری کرنے میں کامیاب ہوتا رہا۔

کیتھولک چرچ نے تعلیم دی تھی کہ وہ راستہ جو دولت مندی کی طرف لے جاتا ہے جہنم کا

راستہ ہے۔ لیکن پیورٹین جو کہ پروٹسٹنٹ کلیسا ہی کا ایک فرقہ ہے، اس کے عالموں نے بالصراحت کہا کہ اگر کوئی دولت حاصل کرنے کے تمام مواقع سے پوا فائدہ نہیں اُٹھا رہا ہے تو خدا کی عبادت کا صحیح حق ادا نہیں کر رہا ہے۔ اسی طرح میتھوڈسٹ فرقے کا رہنما ویزلے لکھتا ہے۔

''تم کسی شخص کو محنتی اور کفایت شعار بننے سے نہیں روک سکتے اور اسے نہ روکو۔ بلکہ ہم کو چاہیئے کہ ہم تمام عیسائیوں کو ترغیب دیں کہ وہ جتنا زیادہ سے زیادہ حاصل کر سکتے ہیں حاصل کریں اور جتنا زیادہ سے زیادہ بچا سکیں بچائیں، دراصل دولت مند بننے کا یہی طریقہ ہے۔''

کال ونسٹ فرقہ بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ سولہویں صدی میں جب پروٹسٹنٹ فرقے نے اصلاح وتجدید کی تحریک شروع کی تھی یہ وہ دور تھا جب سرمایہ اکٹھا کرنے کی ضرورتوں کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی اور اس کے لیے سود پر پابندیاں حارج ہو رہی تھی۔ اس وقت پروٹسٹنٹ کلیسا نے ان ضرورتوں کی تکمیل کی طرف قدم اُٹھایا تھا۔ اسی طرح اسی کے ایک دوسرے فرقے کالونسٹ نے بھی سرمایہ پرست مہم جو طبقے کے مطلب کی باتیں کیں، حالانکہ اس سے پہلے کیتھولک چرچ ان تاجروں کو جو دولت کی ہوس میں گرفتار تھے گنہگار سمجھتا تھا۔ اب اس کے مقابلے میں پروٹسٹنٹ کالون نے کہا:

''آخر تجارت کا نفع زمینداری کے نفع سے زیادہ کیوں نہ ہو۔ تجارت کا منافع تاجر کی محنت اور ہنرمندی کے سوا کہاں سے آتا ہے۔''

اس لئے اگر کال ونزم (Calvinism) ابھرتے ہوئے بورژوا طبقے کا مذہب بن گیا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ امریکی پیورٹین بھی کالون ہی کے پیرو تھے جو امریکہ کے نیو انگلینڈ میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کے نزدیک وہی انسان سب سے اچھا مسیحی تھا جس کا ہر قدم حصول دولت کے لیے بڑھ رہا ہو۔ یہ عقیدہ سرمایہ داری نظام کی روح سے کتنا قریب ہے!

چنانچہ عیسائیت کی تعلیمات میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں یہ سرمایہ داری نظام کی ترقی کے تقاضوں ہی کا نتیجہ تھیں۔ دولت کے انبار جو تجارت کے راستے آتے تھے اُنہوں نے خانماں برباد مزدور طبقہ کو جنم دے کر صنعتی سرمایہ داری کی بنیاد ڈالی، اور فیکٹری سسٹم نے اس دولت میں مزید اضافہ کیا۔ اس نئی دولت کے مالکوں کے تجربے نے انہیں یہ بتایا کہ اگر وہ دولت بچا بچا کر اکٹھا کریں اور پھر اس دولت کو تجارت یا صنعت میں لگا دیں تو خدا کی بادشاہت کے حقدار ثابت

ہو سکتے ہیں۔اس طرح سے یہ دُنیاوی اور دینی نظام جسے آج ہم اچھی طرح جانتے ہیں وجود میں آیا۔

15

بوئے اور، کاٹے کوئی اور

(نیو ہیو برمین نے اس کتاب کو یورپ کے مطالعے تک محدود رکھا ہے اور اس کو اس نے مشرقی ممالک کے یورپی ممالک کے ہاتھوں استحصال کا ذکر کیا ہے لیکن صنعتی انقلاب کی ضمن میں ہیو برمن نے یہ نہیں بتایا کہ اس استحصال نے صنعتی انقلاب کو بڑھانے میں کتنا اہم کردار ادا کیا۔ چونکہ اُردو میں اس کتاب کو پڑھنے والوں کے لیے یہ پہلو بھی دلچسپی کا باعث ہوگا اس لئے مندرجہ ذیل تین پیراگراف میں میں نے صنعتی انقلاب کی تاریخ کے کچھ ماہرین کی تحریروں سے اس بارے میں چند حقائق کا ذکر کیا ہے ع۔م)

اٹھارویں صدی کے وسط تک انگلستان زیادہ تر ایک زراعتی ملک تھا۔تقریباً 1760 کے بعد سے اس ملک میں تیزی سے مشینی ایجادیں ہونا شروع ہوئیں جنہوں نے ایک زبردست انقلاب کی بنیادیں ڈالیں جو تاریخ میں صنعتی انقلاب کے نام سے مشہور ہے حالانکہ انگلستان ایک طویل عرصے سے معاشی تبدیلیوں سے گذر رہا تھا لیکن ذرائع پیداوار میں یہ ایجادیں۔''یکا یک'' ایک مخصوص زمانے میں کیوں ظاہر ہوئیں؟ اس سوال کا جواب پام دت کی زبانی سنئے:

> ''اٹھاوریں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں (برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں) جو لوٹ مار مچائی گئی اس کی بنیادوں پر جدید انگلستان کی تعمیر ہوئی۔ جب 1757 میں پلاسی کی جنگ ہوئی اور اس میں برطانیہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ریشہ دوانیاں کر کے فتح حاصل کر لی تو اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان بند ٹوٹ گیا ہو۔ ہندوستان کی دولت سمندری طوفان کی

طرح انگلستان میں آنے لگی۔ اس دولت کی فراوانی نے انگلستان میں ایجادات کے لیے فضا سازگار بنادی۔ پلاسی کی جنگ کے فوراً بعد انگلستان میں کئی بڑی بڑی چیزیں ایجاد ہوئیں جن سے صنعتی انقلاب کی ابتدا ہوئی۔''

1764 میں ہارگریوز نے کاتنے کی مشین ایجاد کی 1765 میں واٹ نے بھاپ کا انجمن بنا یا، جسے 1769 میں پٹینٹ کر دیا گیا تا کہ کوئی اور شخص موجد کی بغیر اس مشین کو نہیں بنا سکے۔ 1755 میں آرک رائٹ نے سوتی کپڑے کی دوسری مشینیں ایجاد کیں۔ 1785 میں کارٹ رائٹ نے بھاپ سے کرگھے چلانا شروع کئے اور 1788 میں کئی ایک اور انجمن اور بھٹیاں بھاپ سے چلنے لگیں۔ ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اب انگلستان میں ان ایجادوں سے فائدہ اُٹھانے کے مواقع کھل گئے تھے، کیونکہ اس سے پہلے بھی، اٹھارویں صدی کے ابتدائی نصف میں، کئی ایک ایجادات مارکیٹ) نہیں تھے اس لئے ان ایجادات کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مثال کے طور پر 1738 میں وائٹ نے پانی کی طاقت سے چلنے والی کپڑا بننے کی مشین ایجاد کی، لیکن وہ رائج نہیں ہوسکی۔ اسی طرح اس سے پہلے فلائنگ شنل ایجاد ہوئی لیکن وہ بھی رواج نہ پاسکی۔

برطانیہ کی صنعتی تاریخ کے ماہر ڈاکٹر کنگھم نے اپنی کتاب عہد جدید میں برطانوی صنعت و تجارت کی ترقی میں لکھا ہے کہ برطانیہ میں اس زمانے میں اتنے بڑے پیمانے پر ایجادیں صرف اس لئے نہیں ہونے لگی تھیں کہ ''جیسے لوگوں کی ذہانت آنا'' فاناً'' پھوٹ پڑی ہو اور اس کی صحیح طریقہ سے کوئی توجیہہ نہ کی جاسکتی ہو۔'' بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ ملک میں سرمایہ اتنا اکٹھا ہوگیا تھا کہ ان ایجادات کا مصرف نکلنے کا امکان پیدا ہوگیا تھا۔ کنگھم مزید لکھتا ہے۔

''آرک رائٹ اور واٹ خوش قسمت تھے کہ حالات ان کے موافق تھے۔ جب قیمتی آلات بنائے جاتے ہیں یا ایسے طریقے معلوم کئے جاتے ہیں جن میں لاگت بہت آتی ہے تو اس کے لیے بڑے سرمائے کی ضرورت پڑتی ہے۔ کوئی آدمی خواہ وہ کتنا ہی ذہین اور محنتی کیوں نہ ہو کسی چیز پر اس وقت تک محنت نہیں کرے گا جب تک اس کو کافی سرمایہ نہ مل سکتا ہو اور وہ جو چیز بنائے اس کے لیے وسیع منڈی نہ ہو۔ اٹھارویں صدی میں ان دونوں چیزوں کے نقطۂ نظر سے حالات زیادہ سے زیادہ موافق بن رہے تھے بنک اوف انگلینڈ اور دوسرے بہت سے بنک قائم ہو چکے تھے جن کی وجہ سے سرمایہ اکٹھا ہو رہا تھا۔ اب ایک قابل اور ہوشیار آدمی کیلئے

پہلے سے کہیں زیادہ آسان ہو گیا تھا کہ وہ اپنے کاروبار میں نئے قیمتی اور ترقی یافتہ طریقے رائج کر سکے۔''

یہ وجہ تھی کہ جب مثلاً واٹ کا ایجاد کردہ بھاپ کا انجن مارکیٹ میں آیا تو اس نے انگلستان کی صنعت میں فوراً مقبولیت حاصل کر لی۔ 1800 تک یہ 30 کوئلے کی کانوں 22 تانبے کی کانوں، 28 فاؤنڈ ویوں 17 شراب کی بھٹیوں اور 84 سوت کی ملوں میں استعمال کیا جانے لگا تھا۔

زرعی اور صنعتی انقلابیوں نے نقل وحمل کے ذرائع میں بھی تبدیلیاں پیدا کر دیں کیونکہ اگر کھیتوں سے خام مال کارخانوں تک، اور کارخانوں میں تیار ہونے والی مصنوعات جلد سے جلد بازار تک نہ پہنچائی جاتیں تو صنعت کار کو خسارہ برداشت کرنا پڑتا۔ اس لئے ذرائع نقل وحمل کو بہتر اور تیز رفتار بنانا بھی اس کی اپنی ضرورت تھی۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کی یہی ضرورتیں تھیں جو سڑکوں کی تعمیر اور نہروں کی کھدائی کی موجب بنیں۔ جون مک ایڈم انجینئر کی سڑک انیسویں صدی کی ابتدا میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہی ریل اور بھاپ سے چلنے والے جہازوں کا رواج شروع ہو گیا۔ اسی دوران میں دریاؤں کے پیٹے اور گہرے کئے گئے اور لمبی لمبی اور گہری نہریں کھود کر اور انہیں ایک دوسرے سے قریب کر کے نقل وحمل کو زیادہ سے زیادہ سہولت اور وسعت دی گئی۔

آبادی میں اضافے، ذرائع نقل وحمل میں انقلاب، زراعت اور صنعت میں غیر معمولی ترقیاں سب آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ گہرا رشتہ رکھتی تھیں اور بڑی حد تک ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں۔ یہ سب انقلاب ایک ''جہان تازہ'' کی تخلیق کا باعث ہو رہے تھے، لیکن اس ''جہان تازہ'' نے ایک زبردست تضاد کو بھی جنم دیا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ مشین اور ایجادات انسانی زندگی میں آسودگی کا باعث ہوں گے۔ لیکن ہوا کیا اس کا ذکر مشہور برطانوی وزیر اعظم اور ناول نویس ڈزریلی نے اپنے ناول سبل (Sybil) میں کیا ہے:

''دو قومیں ہیں جن کے درمیان نہ باہمی سلوک ہے اور نہ ہمدردی دونوں قومیں ایک دوسرے کے خیالات، عادات واطوار اور محسوسات سے بھی ناواقف ہیں، جیسے یہ دونوں قومیں دُنیا کے دو الگ گوشوں کی رہنے والی ہوں یا دونوں ایسے دو سیاروں کی باسی ہوں جن میں آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ ان کی نسلیں بھی الگ معلوم ہوتی ہیں

یہ دونوں قومیں الگ الگ غذائیں استعمال کرتی ہیں، ان کے انداز واطوار بھی مختلف ہیں اور ان دونوں کے لئے قوانین بھی الگ الگ وضع کئے گئے ہیں۔

تم کس کا ذکر کر رہے ہو؟ اگر یمونٹ نے جھجکتے ہوئے پوچھا،

''امیروں کا اور غریبوں کا۔''

امیر اور غریب کی یہ تقسیم نئی نہ تھی، لیکن پہلے زمانوں میں اتنی واضح بھی نہ تھی اور ان میں اتنا بعد بھی نہ تھا۔ لیکن مشین کے وجود میں آتے ہی اور فیکٹریوں کے رواج پاتے ہی ان دونوں طبقوں یعنی کارخانے کے مالکوں اور مزدوروں کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج پیدا ہوگئی۔ مالدار اور زیادہ مالدار ہوتے گئے۔ اور غریب اپنے ذرائع پیداوار سے کٹ کر غریب تر ہوتے گئے۔ دستکاروں، جولاہوں وغیرہ پر اس تبدیلی کا بہت برا اثر پڑا۔ یہ لوگ پہلے اپنی گذر اوقات کے لیے معقول رقم پیدا کرلیا کرتے تھے، لیکن اب مشینی مصنوعات سے مقابلے کی وجہ سے نہ صرف مفلسی بلکہ بے بسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔

سرمایہ داری نظام جیسے جیسے ترقی کرتا گیا ویسے ویسے لوگوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والوں کی زندگیاں اجیرن ہوتی گئیں۔ یہ زندگیاں کیا تھیں عذاب کا ایک جیتا جاگتا مظہر تھیں۔ لوگ موت کو زندگی پر ترجیح دیتے تھے۔ اس دور کے مظالم پر جتنی تصنیفات وجود میں آئیں غالباً انگریزی زبان میں کسی اور موضوع پر اتنی کتب شائع نہیں ہوئیں۔ ان میں ناول بھی تھے۔ افسانے اور شاعری بھی اور تحقیقی کتب بھی۔ اس کا اندازہ ایک تحقیقی کتاب کے ایک اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے، جس میں ٹومس ہیتھ کا، جو ایک جولاہا تھا، بیان دیا گیا ہے۔

''سوال: تمہارے کتنے لڑکے ہیں؟

جواب: دو لڑکے تھے لیکن شکر ہے دونوں مر گئے

سوال: کیا تم کو ان کے مرنے سے سکون ہوا؟

جواب: جی ہاں بہت! اس احسان کے لیے خدا کا بہت بہت شکر گذار ہوں کہ ان کی پرورش کے بوجھ سے نجات پا گیا۔ وہ غریب، پیاری جانیں بھی اس فانی زندگی کے عذابوں سے نجات پا گئیں۔''

مشینوں کی ایجادات کے ساتھ جو کارخانے وجود میں آئے اور اُنہوں نے اس میں کام کرنے کے جو طور رائج کئے وہ انسانوں کے لئے بالکل نئے تھے، یہ ایک نئی زندگی تھی جس کا بوجھ

MashalBooks.com

ان کے لیے نا قابل برداشت تھا۔ روزانہ کام کے لمبے گھنٹے ان کے لئے اتنے پریشان کن نہ تھے۔ یہ لوگ دن میں کئی کئی گھنٹے کام کرنے کے عادی تھے۔ وہ اپنے گھروں میں بھی گھریلو نظام کے تحت رات گئے تک کام کرتے رہتے۔ ان کو اصل پریشانی فیکٹری کے نظام اور ضابطے کی پابندی سے تھی جس کے وہ کبھی عادی نہ تھے۔ ایک خاص مقررہ وقت پر کام شروع کرنا اور خاص مقررہ وقت پر چھٹی پانا، یہ باتیں ان کے لیے بالکل نئی تھیں۔ مشین کی جنبش کے ساتھ اپنے ہاتھ پاؤں ہلانا جیسے کہ وہ خود ایک مشین ہوں، یہ ڈھنگ ان کے لئے نفسیاتی دھچکے سے کم نہیں تھا۔

مانچسٹر کے پاس کے ایک مل میں کاتنے والے مزدوروں کو روزانہ چودہ گھنٹے کا کام کرنا پڑتا تھا۔ اسی اور چوراسی درجے کے ٹمپریچر میں بھی وہ برابر محنت کرتے رہتے تھے۔ کام کے دوران وہ پانی کا گلاس تک بھی طلب نہیں کر سکتے تھے۔ مل کے قواعد وضوابط کی خلاف ورزی کی پاداش میں ان کو حسب ذیل سزائیں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔

- اگر کسی کاتنے والے کی کھڑکی کھلی پائی جائے تو اس پر 1 شلنگ جرمانہ
- اگر کوئی کاتنے والا کام کے وقت گندا پایا جائے اس پر 1 شلنگ جرمانہ
- اگر کوئی کام کے دوران ہاتھ منہ دھوتا ہوا پایا جائے اس پر 1 شلنگ جرمانہ
- اگر کوئی کاتنے والا روشنی جلا کر مرمت کر رہا ہو تو اس پر 2 شلنگ جرمانہ
- اگر کوئی کاتنے والا صبح کو دیر تک روشنی جلائے اس پر 2 شلنگ جرمانہ
- اگر کوئی کاتنے والا سیٹی بجاتا ہوا پایا جائے اس پر 2 شلنگ جرمانہ

سزاؤں کی یہ فہرست من گھڑت نہیں۔ اس دور کی اکثر کتابوں میں ان سے بھی سخت سزاؤں کی فہرست دی گئی ہے۔ اس زمانے میں سرمایہ داروں کا خیال تھا کہ وہ ان تمام چیزوں کے ساتھ جو ان کی ملکیت تھیں جیسا چاہتے سلوک کر سکتے تھے اور مشینوں کے ساتھ وہ مشینوں پر کام کرنے والے مزدوروں کو بھی اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔ بلکہ صحیح بات تو یہ ہے چونکہ مشینوں کی خریداری پر سرمایہ داروں کو بڑی رقمیں خرچ کرنا پڑتی تھیں اس لئے ان کو بدقسمت مزدوروں کے مقابلے میں اپنی مشینوں کا زیادہ خیال رہتا تھا!

وہ ان مزدوروں کو اجرت دینے میں جتنی بھی کفایت کر سکتے تھے کرتے تھے کفایت شعاری کے لیے مرد مزدوروں کی بجائے ان کی عورتوں اور بچوں کو کام پر لگا لیتے تھے۔ اس لئے اکثر مرد گھروں پر بیکار پڑے رہتے جبکہ عورتیں اور بچے ان فیکٹریوں میں کام کرتے۔ پہلے پہل

MashalBooks.com

فیکٹریوں کے مالکوں نے محتاج خانوں کے منیجروں سے معاملہ کیا اور محتاج بچوں سے فیکٹریوں میں کام لینا شروع کیا۔ ان حالات میں مزدوری کی شرح اتنی کم ہوگئی کہ ماں اور باپ دونوں مل کر اتنا نہیں کما سکتے تھے کہ بچوں کا بھی پیٹ بھر سکیں۔ یہ ایک اور وجہ تھی جس کے باعث بچے ملوں اور کانوں میں کام کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اس دور کے مظالم کی داستان اتنی المناک اور رلا دینے والی ہے کہ آج بھی جب دُنیا بالکل ہی بدل گئی ہے اور اب یہ تمام مظالم قصہ پارینہ بن گئے ہیں، اس کے باوجود ان حالت کے متعلق اب بھی جب پڑھا جاتا ہے یا لکھا جاتا ہے تو دل دہل جاتا ہے۔ لیکن ان کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ تاکہ سرمایہ داری نظام کی فلک بوس عمارتوں اور محلات جن انسانوں، بچوں اور عورتوں کے خون پسینے کی محنت سے کھڑے ہوئے ہیں ان کی زندگیوں اور ان پر روا رکھنے والے مظالم کا پورا پورا ادراک ہو سکے۔

جون موس، جو مانچسٹر کی ایک مل میں ماسٹر اپرنٹس (زیر تربیت اُمیدواروں کا انچارج) رہ چکا تھا، 1816 میں انگلستان کی پارلیمنٹ کی ایک کمیٹی کے سامنے مزدور بچوں کے حالا بتانے نے کیلئے پیش ہوا۔ کچھ سوالات اور جوابات مندرجہ ذیل ہیں:

''کیا یہ اپرنٹس بچے چرچ کے خیرات خانے سے لئے گئے تھے؟''

''جی ہاں یہ تمام بچے کلیسائی خیرات خانے سے آئے تھے۔''

''وہ کس عمر میں بھرتی کئے گئے تھے؟''

''جو لندن سے آئے تھے ان کی عمریں سات برس سے گیارہ سال کے درمیان تھیں، جو اور پول سے آئے تھے وہ آٹھ دس اور پندرہ سال کے درمیان تھے۔''

''ان کو کتنی مدت تک اُمیدوار کی حیثیت سے کام کرنا پڑتا تھا؟''

''اکیس روز تک۔''

''ان کے کام کے اوقات کیا تھے؟''

''صبح 5 بجے سے رات 8 بجے تک''

''کیا قاعدہ کے مطابق روزانہ کام کی معیاد پندرہ گھنٹے تھی؟''

''جی ہاں!''

''جب مشین مرمت کیلئے روک دی جاتی، یا روئی نہ ہونے کی وجہ سے روک دی جاتی، کیا

لڑکوں کو اس مدت کا کام بھی پورا کرنا پڑتا تھا۔''

''جی ہاں!''

''بچے کھڑے کھڑے کام کرتے تھے یا بیٹھ کر؟''

''کھڑے کھڑے''

''کیا وہ کھڑے کھڑے سارا کام ختم کرتے تھے؟''

''جی ہاں کھڑے رہ کر''

''کیا مل میں کہیں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی؟''

''کہیں نہیں، ان کو اکثر کارخانے کے فرش پر اس وقت بھی پایا گیا جب ان کو بستروں میں ہونا چاہیئے تھا۔''

''کیا یہ بچے کبھی مشین سے زخمی بھی ہوئے؟'' ''جی ہاں یہ تو اکثر ہوتا ہی رہتا ہے۔''

ایک کارخانہ دار جی۔اے لی کا جو ایک کاٹن مل کا مالک تھا، قول تھا ''اخلاق کے لیے اس سے زیادہ مفید اور کیا بات ہوسکتی ہے کہ انسان بالکل ابتدائی عمر سے مطیع و فرمانبردار، ہنرمند اور پابند اوقات ہو جائے۔'' مسٹر گڈی جو رائل سوسائٹی کا صدر تھا، وہ بھی مزدوروں کے بچوں کی تعلیم کا بڑا مخالف تھا۔ چنانچہ جب علاقے میں بچوں کا ایک سکول قائم کرنے کی تجویز پیش ہوئی تو اس نے زبردست مخالفت کی اور کہا۔

''نیچے طبقے کے مزدور بچوں کو تعلیم دلانے کا صرف یہ نتیجہ ہوگا کہ ان کے اخلاق بھی بگڑ جائیں گے اور ان کی دلی مسرت بھی چھن جائے گی۔ یہ تعلیم ان کو اپنی موجودہ حالت پر قانع نہ رہنے دے گی اور وہ نہ کھیتی باڑی کے لئے اچھے نوکر ثابت ہوں گے اور نہ کسی محنت طلب ملازمت کے لائق رہ جائیں گے۔ سماج میں دراصل ان کے یہی اصلی فرائض ہیں۔ اب تعلیم پانے کے بعد وہ ان کاموں کے بجائے باغیانہ رسالے پڑھنے کے لائق ہو جائیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے بزرگوں کی شان میں گستاخانہ باتیں کرنے لگیں گے.... [۱]''

اس ظالمانہ نظام کے خلاف انیسویں صدی میں محنت کشوں کو بہت سی جدوجہدیں کرنا پڑیں۔ سب سے پہلی جدوجہد کارخانوں میں کام کا وقت کم کرنے کے لئے ہوئی۔ اراکین پارلیمنٹ نے بھی اس بات کا مطالبہ کیا کہ مزدوروں کے اوقات کار چودہ گھنٹے سے گھٹا کر دس گھنٹے

MashalBooks.com

یومیہ کر دیئے جائیں۔

لہ یورپ کے اس دور کا ذکر کرتے ہوئے مجھے اپنے ہاں کے پرانے زمینداروں کا دور یاد آجاتا ہے۔ بعینہ اسی قسم کی گفتگو تو اب امیر احمد خاں اوف کالا باغ نے، جو دن یونٹ پاکستان کے گورنر تھے، ایک نجی محفل میں کی تھی، وہ عورتوں کی تعلیم کے بعد زبردست مخالف تھے۔ صرف وہی نہیں بلکہ سرسید احمد خاں بھی عورتوں کی تعلیم کے مخالف ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ جب ایک کشمیری پنڈت نے جس نے اسلام قبول کر لیا تھا اور جو خود سرسید کے بڑے عزیز دوست تھے، عورتوں کا سکول علی گڑھ میں قائم کیا تو سرسید نے اس کی شدید مخالفت کی (ع۔م)

اس تحریک کو اصل میں شہ فرانس کے مزدوروں سے ملی۔ یہ حقیقت ہے کہ انگلستان کے مقابلے میں فرانس میں مزدور طبقے نے مقابلۃً زیادہ شعور کا مظاہرہ کیا۔ اُنہوں نے 1831 میں سلک انڈسٹری کے مرکز میں مزدوروں اور جولاہوں کے احتجاجی مظاہروں کا اہتمام کیا اور سلک انڈسٹری کے مرکزی شہری لے یاں (Lyon) پر قبضہ کر لیا۔ ان کے پرچموں پر لکھا تھا۔ ''ہم لڑتے لڑتے مرنے کے لیے تیار ہیں تاکہ ہمیں محنت کرنے اور زندہ رہنے کا حق حاصل ہو۔'' انگلستان میں جب اوقات کار کی کمی کی تحریک چلی تو امریکہ اور انگلستان کے صنعت کاروں نے اوقات کار پر پابندی کو انسان کی قدرتی آزادی میں مداخلت قرار دیا۔ ان کارخانہ داروں نے یہ دلیل ایڈم سمتھ کی کتاب سے لی تھی جو ''ہمیں اپنے حال پہ چھوڑ دو'' کے نعرے کا علمبردار تھا۔ یہ کارخانہ دار ایڈم سمتھ کی کتاب Wealth of Nations سے یہ اقتباس پیش کرتے تھے۔

> ''وہ ملکیت جو ہر آدمی اپنی محنت سے پیدا کرتا ہے اور جو دراصل دوسری تمام املاک کی بنیاد ہے، بہت مقدس ہے۔ اس پر کبھی حملہ نہیں کیا جا سکتا ایک غریب آدمی کی آبائی املاک اس کی محنت اور اس کے ہاتھوں کی ہنرمندی ہے۔ کسی شخص کو اس کی محنت اور ہنرمندی کے استعمال سے روکنا اس مقدس املاک میں بے جا مداخلت ہے۔''

کارخانہ داروں اور حکمراں طبقوں کے ایسی دلائل نے محنت کشوں کو تنگ آمد بہ جنگ آمد کی راہ پر ڈال دیا اور اُنہوں نے محسوس کیا کہ جب یہ مشینیں نہیں تھیں تو ان کی زندگی بہتر گزر رہی تھی۔ انہیں ماضی کے ''اچھے'' وقتوں کی یاد ستانے لگی اور مشین ان کو اپنی دُشمن نظر آنے لگی۔ چنانچہ مزدوروں کے ہجوم کارخانوں میں مشینوں کو توڑنے اور املاک کو نذر آتش کرنے لگے۔ ان

کی زبانوں پر یہ گیت تھا۔

ہم کاندھے جوڑ کر کھڑے ہوں گے
اور ہم سختی سے قسم کھا کر کہتے ہیں
ہم توڑ ڈالیں گے
ان بھاپ اڑاتی مشینوں کو
اور آگ لگادیں گے مل کو

یہ سال 1812 تھا، جب انگلستان کی پارلیمنٹ نے مشین توڑنے اور کارخانوں میں توڑ پھوڑ کرنے والوں کے لئے سزائے موت کا قانون منظور کیا۔ بالاخر مزدوروں نے اپنے تلخ تجربوں سے یہ سیکھا کہ مشین کو اور کارخانے کو تباہ کرنے سے ان کے دکھوں کا مداوا نہیں ہوگا۔ اور اُنہوں نے اپنا زور اس بات پر لگایا کہ حکومت سرمایہ دار طبقوں کے ہاتھوں سے نکل کر ایسے نچلے طبقے کے ہاتھوں میں آئے جو ان سے ہمدردی رکھتا ہو۔ اس کے بعد ہی پارلیمانی اصلاحات کی تحریک شروع ہوئی۔ اور پھر 1830 میں جب اقتصادی بحران نے دوسری بار سر نکالا اور کارخانہ دار بھی شامل ہوگئے لیکن اس کے نتیجے میں 1832 کے سال میں جو پارلیمانی اصلاحات نافذ کی گئیں اس میں مزدوروں کے بنیادی مطالبات یعنی بالغ رائے دہندگی اور خفیہ رائے شماری کے مطالبات کو سرے سے ہی رد کر دیا گیا۔ صرف چھوٹے زمینداروں، ان کے مخصوص مزارعوں اور چند صاحب جائیداد افراد کو ووٹ کا حق دیا گیا۔ جب مزدوروں نے محسوس کیا کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے تو وہ اور بھی ریڈکل ہوگئے۔ اب وہ نہ صرف حکومت میں مزدوروں کا حصہ مانگنے لگے بلکہ نئے قسم کے مزدور معاشرے کے متعلق سوچنے لگے۔

اس دور میں انگلستان کے مزدور روبرٹ اوئن کے خیالات سے متاثر ہونا شروع ہوئے۔ رابرٹ اوئن کو برطانوی اشتراکیت کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اس کا موقف یہ تھا کہ تمام مزدور ایک بڑی ٹریڈ یونین میں منظّم ہوں۔ چنانچہ 1834 میں The Grand Consolidated Trade Union قائم ہوئی اور دیکھتے دیکھتے ٹریڈ یونینوں کے ارکان کی تعداد پانچ لاکھ ہوگئی۔ اس ٹریڈ یونین کے زیر اہتمام مزدوروں نے اپنے مطالبات منوانے کے لیے پے در پے ہڑتالیں کیں۔ جب حکومت نے تشدد کے ذریعے ان ہڑتالوں کو دبا دیا تو مزدوروں میں زبردست مایوسی پھیل گئی۔ دو سال بعد لندن میں ایک مزدور ولیم لووٹ نے لندن ورکنگ مینز

ایسوسی ایشن کے نام سے تنظیم قائم کی اور اس تنظیم کی طرف سے مئی 1838 میں ایک عوامی منشور (People,s Charter) کے نام سے شائع کیا۔ اس چارٹر میں چھ مطالبات پیش کئے گئے تھے۔

1۔ پارلیمنٹ کا سالانہ انتخاب 2۔ بالغ رائے دہندگی

3۔ مساویانہ حلقہ انتخاب 4۔ رائے دہندوں کے لیے جائیداد وغیرہ کی کوئی شرط عائد نہ کی جائے۔

5۔ انتخابات میں حصہ لینے والے اُمیدواروں سے کوئی فیس یا معاوضہ نہ لیا جائے۔

6۔ رائے شماری خفیہ طور پر ہو۔

اس طرح سے مزدوروں نے سیاسی جمہوریت کی جنگ لڑی جو اُنہوں نے بالآخر جیت لی۔ لیکن ان کی اپنی زندگی بہتر نہ ہوسکی۔ اس کام کے لئے ٹریڈ یونین بڑے پیمانے پر منظّم ہونے شروع ہوئیں۔ اس ضمن میں بھی ایڈم سمتھ نے واضح طور پر اظہار خیال کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

''مزدور کی عام اجرت ہر جگہ اس معاہدے پر منحصر ہے جو دونوں جماعتوں کے درمیان انجام پاتا ہے۔ یہ دونوں جماعتیں دو طرح کے مفاد رکھتی ہیں اور ان دونوں میں اشتراک مقاصد کا کوئی امکان نہیں۔ مزدور چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اجرت حاصل کرے لیکن مالک سے جہاں تک بن پڑتا ہے۔ اجرت کی شرح کم سے کم تر رکھتا ہے۔ مزدور اپنی جماعتیں منظّم کرتے ہیں تاکہ اجرت کی شرح بڑھوا سکیں اور مالک متحد ہوتے ہیں تاکہ اجرتوں کی شرح جتنی بھی کم ہوسکے کرلی جائے۔ یہ اندازہ لگانا کہ اس مقابلے میں کس جماعت کو کامیابی نصیب ہوتی ہے زیادہ دشوار نہیں ہے۔ مالک تعداد میں کم ہونے کی وجہ سے آسانی کے ساتھ منظّم ہوسکتے ہیں اور قانون بھی ان کو اس کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن مزدوروں کو یہ رعایت بھی حاصل نہیں۔ پارلیمنٹ نے کوئی ایسا قانون پاس نہیں کیا جو اجرتوں کو کم کرنے سے منع کرتا ہو، لیکن ایسے بہت سے قوانین ہیں جو مزدوروں کی جدوجہد میں رکاوٹ بنتے ہیں۔''

ایڈم سمتھ نے 1776 میں جو لکھا تھا وہ ایک حد تک صدیاں گزرے کے بعد بھی درست دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ امریکہ کی صورت حال کے متعلق عیسائی فرقہ کی میتھوڈسٹ فیڈریشن

نے 1935 میں امریکہ میں ٹریڈ یونین کی جدوجہد کے متعلق ایک رپورٹ میں کہا تھا:

''ایک بہت ہی بڑی اور بھیانک تحریک یونین کے ممبروں کے خلاف شروع کی گئی ہے۔ ہر روز ایک نقاب پوش گروہ یونین کے کسی نہ کسی سرگرم کارکن کو پیٹتے ہیں۔ پہلا شخص جو اس نقاب پوش گروہ کا شکار ہوا اس کو شہر سے پندرہ میل دور لے جا کر پیٹا گیا اور اس کو مردہ سمجھ کر وہیں پھینک دیا گیا۔ بالآخر یونین کے صدر کو مار ڈالا گیا۔ لیکن اس کے باوجود امریکہ میں ٹریڈ یونین زندہ رہی اور فعال بنتی چلی گئی۔''

صنعتی انقلاب کے زمانے میں انگلستان میں محنت کشوں پر جو بیتی اور اُنہوں نے اس پر جو ردعمل ظاہر کیا اس کا عکس ہمیں انیسویں صدی کے مشہور شاعر شیلے کی نظم ''انگلستان کے باسیوں سے خطاب'' میں ملتا ہے۔

انگلستان کے باشندو تم کس کے لیے ہل چلاتے ہو؟
اس مالک کے لئے جو تمہاری پستی اور تباہی کا ذمہ دار ہے؟
کیا تم اس لئے محنت اور ہنرمندی سے کپڑے بنتے ہو
کہ ظالم دولتمند اس کے کپڑے بنا کر پہنیں؟
تم کس لئے مہد سے لے کر لحد تک کھلاتے، پہناتے
اور بچاتے رہتے ہو ان ناشکرے مفت خوروں کو،
جو تمہارا پسینہ نہیں تمہارا خون چوستے ہیں؟
اے انگلستان کی شہد کی مکھیو! کیا تم اپنے
ہتھیار اور زنجریں اس لئے ڈھالتی ہو کہ یہ
نکمے مفت خورے
تمہاری بے گار کی محنت کے پھل کو بھی برباد کریں؟
کیا تمہیں بھی ملتا ہے آرام اور سکون اور اطمینان،
ٹھنڈا سایہ، غذا کی نرم بھینی خوشبو؟
وہ چیز کیا ہے جو تم اتنی مہنگی خریدتے ہو
اس قدر مصیبت اور خطرات جھیل کے؟
فصل بوتے تم ہو، کاٹتا ہے کوئی اور

دولت نکالتے تم ہو، بٹورتا ہے کوئی اور
لباس تم بنتے ہو، پہنتا ہے کوئی اور
ہتھیار تم ڈھالتے ہو، اُٹھاتا ہے کوئی اور
بیج بوؤ پر کسی ظالم کو فصل مت کاٹنے دو
دولت بناؤ پر کسی مکار کو اکٹھا مت کرنے دو
پوشاکیں بنو، پر کسی کاہل کو مت پہننے دو
ہتھیار ڈھالو، پر اپنی حفاظت کے لیے انہیں خود پہنو.....

MashalBooks.com

16

آزاد تجارت..... خدا حافظ!

ماہرین طبیعات کی طرح معاشیات کے ماہرین نے بھی صنعتی انقلاب کے زمانے میں کچھ معاشی قوانین دریافت کئے تھے اور ان کا دعویٰ تھا کہ سماجی اور اقتصادی دُنیا ان کے دریافت کئے ہوئے انہی قوانین کے مطابق گردش کرتی ہے۔ لیکن بہرحال اس دور کے ماہرین معاشیات ایک خاص زمانے کی پیداوار تھے۔ یہ درست ہے کہ ان کے فکری نتیجوں سے اس زمانے کی بڑی بڑی طاقتور جماعتیں متاثر ہوئیں، سماج کے بعض گروہوں نے ان کے نظریات میں اپنا نفع دیکھ کر ان افکار میں سچائی کی جھلک محسوس کی، اور ان کی تعلیمات کو اپنا لیا، لیکن بعض دوسرے گروہوں نے جو ان کی تعلیمات سے کسی نفع کی اُمید نہیں رکھتے تھے ان کو غلط سمجھ کے ٹھکرا دیا۔

تجارتی انقلاب نے تجارتی طبقے کے ابھار کے لئے راستہ صاف کیا اور تجارتی معاشیات کے فلسفہ کا ''جسے مرکنٹلزم (Mercantilism) کہتے ہیں فروغ ہوا۔ یہ اس زمانے کے مخصوص حالات کا تقاضا تھا۔ فرانس ایک زرعی ملک تھا۔ اس کی زمین اس کی دولت اور فارغ البالی کا ذریعہ تھی۔ اس لئے فزیوکریسی (Physiocracy) کے نظریہ نے فرانس میں آنکھیں کھولیں۔ اسی طرح انگلستان کے صنعتی انقلاب نے بڑے بڑے کارخانوں کو جنم دیا اور ایک نئے معاشی نظام کی بنیاد پڑی۔ اس نظام کے اپنے اُصول اور لین دین اور منافع کمانے کے اپنے طریقے تھے جن کی بنا پر ایک نئی معاشیاتی سائنس کی بنیاد پڑی۔ یہ سائنس کلاسیکی معاشیات (Classical Economices) کے نام سے مشہور ہوئی۔ ایڈم سمتھ کلاسیکی معاشیات کا سب سے بڑا مفکر تھا، گو صرف وہی نہیں تھا جس نے اس سائنس کو آگے بڑھایا۔ اسی متکب فکر سے متعلق دوسرے ماہرین معاشیات بھی گذرے ہیں، مثلاً رکارڈو، مالتھس، جیمس مل اور جون سٹورٹ مل وغیرہ۔ یہ تمام لوگ آپس میں ایک دوسرے کی پوری طرح تائید نہیں کرتے تھے، لیکن بنیادی اُصولوں پر ایک دوسرے سے ضرور متفق تھے۔

اس دور کے تاجروں اور صنعت کاروں نے ان اُصولوں کو بڑی خوشی سے قبول کر لیا کیونکہ

کلاسیکی معاشیات کے نظریات اس طبقے کے مفادات کے لیے ہر طرح موزوں تھے۔ ایڈم سمتھ کی تعلیم کا بنیادی نکتہ یہ تھا:

''ہر شخص برابر یہی کوشش کرتا رہتا ہے کہ اگر اس کے پاس لگانے کے لیے سرمایہ ہو تو وہ کوئی بہت ہی نفع بخش کاروبار ڈھونڈ نکالے، کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنی تمام محنت صرف اپنے نفع کی نیت سے ہی کرتا ہے، لیکن اپنے نفع کی تلاش میں وہ لازمی طور پر ایسے کاروبار کو اپناتا ہے جس سے سماج کی کوئی ضرورت پوری ہو۔''

ایڈم سمتھ اور اس کے مکتب فکر کے ماہرین معاشیات نے جس کلاسیکی معاشیات کو رواج دیا وہ مزدوروں کے مفاد کے خلاف تھیں، اور دوسرے یہ کہ جہاں تک صنعتکاروں اور تاجروں کا تعلق ہے یہ نظریہ خاص طور پر انگلستان کے تاجر طبقے کے مفاد کا ہی نگراں تھا ۔ بہرحال کلاسیکی معاشیات کا چرچا فرانس میں بھی ہوا اور جرمنی میں بھی۔ انیسویں صدی کی ابتدائی چوتھائی میں فرانس اور جرمنی کے اندر معاشیات کے موضوع پر جو بھی کتابیں چھپیں یا تو وہ کلاسیکی معاشیات کے ماہرین کی کتابوں کا ترجمہ تھیں یا ان کے نظریات کی توجیح اور تشریح سے متعلق تھیں، لیکن آہستہ آہستہ مختلف ممالک کی اپنی مخصوص ضرورتوں نے ان ممالک کے تضاد اور خصوصی مفادات کو بھی واضح کرنا شروع کر دیا۔

مثال کے طور پر آزاد تجارت کے مسئلے پر ہی غور کیجئے۔ اس نظریئے کے تمام حامی ماہرین معاشیات جو عالمی تجارت کی آزادی کے علمبردار تھے وہ صرف ملکوں کے اندر کی تجارتی پابندیوں کے خلاف ہی جدوجہد نہیں کر رہے تھے بلکہ ان تمام پابندیوں کے خلاف بھی لڑ رہے تھے جو ایک ملک کو دوسرے ملک سے الگ کر رہی تھیں۔ رکارڈو نے بین الاقوامی تجارت کے آزاد مبادلے پر بڑی واضح گفتگو کی ہے، وہ لکھتا ہے:

''اگر مکمل طور پر آزاد تجارت کا نظام رائج ہو تو اس میں ہر ملک اپنے سرمایہ اور لیبر کو ایسے کاموں میں لگائے گا جس میں اس کو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو..... پیداوار میں اسی طرح اضافہ کر کے انفرادی مفاد پوری مہذب دُنیا میں قوموں کو آپس میں باہمی مفادات اور لین دین کی ایک عالمگیر برادری میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ ہے وہ اُصول جس کی بنا پر یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ شراب فرانس اور پرتگال میں بنائی جائے گی، غلہ امریکہ اور پولینڈ میں پیدا کیا جائے گا۔ اور لوہے،

تانبے اور پیتل کی مصنوعات انگلستان میں ڈھالی جائیں گی۔''

رکارڈو نے بین الاقوامی تجارت اور مصنوعات تیار کرنے کے جو اُصول وضع کیے وہ اس زمانے کے انگلستان کے لیے بہت ہی صحیح اور موزوں تھے۔ چونکہ صنعتی انقلاب سب سے پہلے انگلستان میں آیا تھا اس لئے وہاں کے کارخانہ داروں کو باقی ممالک کے کارخانہ داروں پر فوقیت حاصل تھی اور وہ اس لائق ہو چکے تھے کہ پوری دُنیا کے بازار اپنی فیکٹریوں کی مصنوعات سے بھر دیں۔ اس لئے بین الاقوامی آزاد تجارت سب سے زیادہ ان کے نفع کی چیز تھی۔ لیکن دوسرے ملکوں کے لیے یہ اتنے نفع کی چیز نہ تھی۔ یہ تضاد اور مخصوص ضرورتیں تھیں جن کے باعث آزاد تجارت کے اُصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے امریکہ نے واشنگٹن کے دور حکومت میں ایک حفاظتی محصول کے ذریعے برآمد و درآمد پابندیاں عائد کر دیں۔ اسی طرح دوسرے ممالک نے بھی آزاد برآمد و درآمد پر پابندیاں عائد کرنا شروع کر دیں۔

یہی وجہ تھی کہ 1841 میں ایک جرمن ماہر معاشیات فریڈریش لیسٹ کی تصنیف سیاسی معاشیات کا قومی نظام شائع ہوئی جس میں بین الاقوامی آزاد تجارت پر شدید حملے کئے گئے۔ ایک جرمن اس کتاب میں پوری شدت کے ساتھ بول رہا تھا، وہ لکھتا ہے:

''کوئی بدقسمت قوم جو صنعت و تجارت اور جہاز رانی میں دوسری ترقی یافتہ قوموں سے پیچھے ہے لیکن ان شعبوں میں ترقی کے لئے ذہنی اور مادی صلاحیتیں رکھتی ہے تو اس قوم کو سب سے پہلے اپنی انفرادی قوت و صلاحیت بڑھانا چاہئے تاکہ وہ اس قابل ہو سکے کہ آزاد تجارت کے بازار میں دوسری ترقی یافتہ قوموں کے مقابلے میں کھڑی ہو سکے۔''

لیسٹ اس بات پر مصر تھا کہ چیزوں کا سستا ہونا ضروری نہیں۔ سستی چیزیں مہنگے داموں بھی بیچی جا سکتی ہیں۔ کوئی ملک صرف اپنی مصنوعات کے ڈھیر کی وجہ سے مالدار نہیں ہو سکتا۔ اس کی دولتمندی کا راز صرف اس کی پیداوار کی صلاحیت میں پوشیدہ ہے۔ چنانچہ وہ کہتا تھا کہ انگلستان آزاد تجارت کے نعرے سے پہلے صنعتی طور پر دولتمند بن چکا تھا اور اب کوشش کر رہا ہے کہ دوسری قومیں حصول دولت کی راہ میں اس کو نہ آ لیں۔ چنانچہ اس نے لکھا۔

''یہ کتنی اچھی تدبیر ہے کہ ترقی کے بام بلند پر پہنچنے کے بعد سیڑھی کو لات مار کر نیچے گرا دیا جائے تاکہ پھر کوئی دوسرا چھت پر پہنچنے کی تدبیر ہی نہ کر سکے۔''

MashalBooks.com

اس لئے یسٹ نے حفاظتی تدبیروں کا مطالبہ کیا۔ وہ محاصل، ٹیکسوں اور ڈیوٹیوں کی دیوار کھڑی کر کے اپنی ملکی صنعت کو ترقی دینا چاہتا تھا۔

اس طرح سے آزاد تجارت، کلاسیکی معاشیات اور ایڈم سمتھ کے نظریات جو ایک دن پہلے تمام ترقی یافتہ قوموں کا نعرہ تھے انیسویں صدی میں متروک ٹھہرائے جانے لگے۔ قوموں نے اپنی مصنوعات کی حفاظت کے لئے قانون بنانا شروع کر دیئے اور آزاد تجارت کا نعرہ صرف نعرہ رہ گیا۔

MashalBooks.com

17

اب کارل مارکس آتا ہے

انیسویں صدی کے درمیانے زمانے تک کلاسیکی معاشیاتی تھیوری کا دور دورہ تھا۔ ہر طرف سے معاشی زندگی پر پابندیوں کی مخالفت کی جارہی تھی، حکومت صنعتکاروں کے کاروبار میں مداخلت نہیں کرے۔ قوانین اور ٹیکس ختم کرے۔ ملکوں کے درمیان مصنوعات اور دیگر سامان کے آنے جانے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ یہ مطالبات زوردار طریقوں سے کئے جارہے تھے۔ اور آخر کار تاجروں اور ان کے مفاد کے ترجمان معاشی فلسفیوں کو اپنی جدوجہد میں کامیابی ہوئی۔ ''آزاد تجارت'' کا تصور ایک دُنیا کا ایمان بن گیا۔

لیکن جیسا کہ ہم نے پچھلے باب میں بتایا، انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں آزاد تجارت اور کلاسیکی معاشیاتی تھیوری کا زور ٹوٹنے لگا۔ جیسے جیسے یورپ میں نئی معاشی طاقتیں ابھرنے لگیں ویسے ویسے ہر ایک طاقت نے کوششیں شروع کردیں کہ ان کی مصنوعات اور سامان پر تو کوئی پابندی نہیں لگائے لیکن دوسروں کی مصنوعات کی درآمد پر پابندیاں ہوں۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ یہ تو بین الاقوامی سطح پر ایک معاشی جنگ تھی۔ سرمایہ داری نظام ایک طرف تو پہلے سے بھی زور پکڑ رہا تھا، دوسری طرف اس میں بحران آنا شروع ہوگیا تھا۔

یہ تھا وہ زمانہ جب ایک نئی آواز ابھرنا شروع ہوئی۔ یہ آواز ایک جرمن فلسفی اور ماہر معاشیات کی تھی جو انگلستان میں جلاوطنی کے دن گذار رہا تھا۔ اس فلسفی کا نام کارل مارکس تھا۔ مارکس نے کلاسیکی معاشیات کے کچھ اُصول قبول کئے، لیکن وہ ان کو کسی اور ہی سمت میں لے گیا، ان سے اس نے کوئی اور ہی نتائج اخذ کئے۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا انیسویں صدی میں صنعتی انقلاب کے باعث غریب اور مزدور عوام پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے اور ان کی بھیانک زندگی نے اونچے طبقے کے دانشوروں، شاعروں، ادیبوں اور مصلحین کو بھی بے حد متاثر کیا تھا۔ ان لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے نئے قسم کے سماجوں کے تصورات پیش کرنا شروع کئے جہاں غربت نہ ہو، جہالت نہ ہو، مزدوروں کو طویل گھنٹوں تک محنت نہ کرنا پڑے۔ ان کو علاج معالجوں کی سہولتیں میسر ہوں۔

MashalBooks.com

دوسرے الفاظ میں مفکروں کے ذہن میں ایک سوشلسٹ معاشرے کا خیال ابھرنے لگا تھا۔لیکن اس شروع کے زمانے میں یہ تصور ایک یوٹوپیائی تصور تھا، سائنسی نہیں تھا، اس تصور کی بنیاد ٹھوس معاشیاتی اُصولوں پر قائم نہیں کی گئی تھی۔

مارکس بھی سوشلسٹ تھا۔ وہ محنت کش طبقوں کی حالت سدھارنا چاہتا تھا۔ اس نے بھی ایک ایسا سماج بنانا چاہا جو باقاعدہ سوچی سمجھی ہوئی بنیادوں پر قائم ہو، وہ بھی چاہتا تھا کہ ذرائع پیداوار پر عوام کا قبضہ ہو، لیکن اس نے کسی خیالی جنت کا نقشہ نہیں پیش کیا، نہ ہی اس نے یہ کہا کہ عملاً مستقبل کا سماج کس طرح چلے گا۔ وہ حیرت انگیز طور پر گذرے ہوئے سماجوں سے دلچسپی لیتا تھا۔ وہ سوچتا رہتا تھا کہ پچھلے سماج کیسے ابھرے، بڑھے اور ختم ہو گئے اور رفتہ رفتہ دُنیا کس طرح موجودہ زمانے تک آ پہنچی۔

کارل مارکس بنیادی طور پر ان محرکات کا پتہ لگانا چاہتا تھا جو ایک سماج کے خاتمے اور دوسرے سماج کی تخلیق کا موجب بنتے ہیں، تاکہ وہ سمجھ سکے کہ کونسے محرکات آنے والے سماج کو جنم دیں گے۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس نے آنے والے سماج کے اقتصادی نظام پر غور نہیں کیا۔ اس نے اپنا پورا وقت اپنے دور کے اقتصادی نظام کی چھان بین اور تحقیق پر صرف کر دیا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس سرمایہ داری سماج جس میں وہ زندگی گذار رہا ہے اس کا معاشی پہیہ کس طرح گردش کر رہا ہے ۔ اس کی عظیم الشان تصنیف کا نام کیپٹل (Capital) ہے جو سرمایہ داری پیداوار کا تنقیدی تجربہ ہے۔

مارکس کے اقتصادی نظریئے کا اہم نکتہ یہ ہے کہ سرمایہ داری نظام کی بنیاد مزدور کی محنت کی لوٹ پر قائم ہے اور اس لحاظ سے سرمایہ داری نظام اپنے تمام پیشتر ونظاموں، یعنی دور غلامی اور جاگیرداری دور سے صرف اس طرح مختلف ہے کہ پہلے نظاموں میں استحصال اور لوٹ کھسوٹ کا عمل سامنے نظر آتا تھا۔لیکن سرمایہ داری نظام میں ''لوٹ'' چھپی ہوئی لوٹ ہے اور اس پر بہت سے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ مارکس نے یہ پردے ''قدرے زائد'' کا نظریہ پیش کر کے چاک کر دیئے۔

مارکس کے نزدیک ایک چیز اس وقت کموڈٹی (تجارتی چیز) بن جاتی ہے جب وہ براہ راست استعمال کے لیے نہیں بلکہ مبادلے کے لیے پیدا کی جائے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

''ایک شخص جو براہ راست اپنی ضرورت کی تسکین کے لئے کوئی چیز پیدا کرتا بلاشبہ استعمالی

قدر پیدا کرتا ہے۔لیکن وہ کموڈٹی نہیں پیدا کرتا۔کموڈٹی پیدا کرنے کیلئے استعمالی قدر ہی نہیں بلکہ ایسی چیز بنانے کی ضرورت ہوتی جو استعمالی قدر ہو۔''

چنانچہ ایک شخص جو کوٹ اپنے استعمال کے لیے نہیں بلکہ مبادلے اور فروخت کیلئے بناتا ہے وہ ایک کموڈٹی تیار کر رہا ہے۔

اب بہت ہی اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کموڈٹی کا مبادلہ کس شرح سے ہونا چاہیئے ؟ وہ کیا چیز ہے جو اس کموڈٹی کی قدر متعین کرے گی؟ اس کے متعلق وہ لکھتا ہے:

''چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ چیز جو کسی شہ کی قدر کی مقدار مقرر کرتی ہے وہ مزدور کی وہ مقدار ہے جو سماجی طور پر اس کے بنانے کیلئے ضروری ہوتی ہے، یا مزدوری پر صرف کئے جانے والا وہ وقت (لیبر ٹائم) ہے جو اس کو بنانے پر صرف کرنا ضروری ہوتا ہے.....(چنانچہ) ایک کموڈٹی کی قدر کا کسی دوسری کموڈٹی کی قدر کے ساتھ وہی تناسب ہوگا جو تناسب ایک پر صرف کئے جانے والے ضروری لیبر ٹائم اور دوسری پر صرف کئے جانے والے ضروری لیبر ٹائم کے درمیان ہوگا۔''

اس لئے اگر ایک کوٹ کے بنانے پر سولہ گھنٹے صرف ہوئے تھے اور اس کے مقابلے میں جوتے کے بنانے پر صرف آٹھ گھنٹے صرف ہوئے تو قیمتوں میں بھی اسی مقدار سے فرق ہوگا۔ کوٹ پر چونکہ جوتے کے مقابلے میں دوگنا وقت صرف ہوا ہے اس لئے کوٹ کی قیمت بھی جوتے کے مقابلے میں دوگنی ہوگی۔ مارکس اس امر پر بھی اصرار کرتا ہے کہ ہر قسم کی محنت یکساں ہے۔اس لئے تمام محنتوں کا مقابلہ ممکن ہے۔غیر تربیت یافتہ اور تربیت یافتہ مزدور کی محنت میں یہ فرق ہے کہ موخر الذکر اول الذکر سے کچھ گنا زیادہ ہوتی ہے جس کی قدر کو مناسب نمبر سے ضرب دے کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

بعض ممکنہ سوالوں کا جواب بھی اس نے خود ہی دیا ہے۔چنانچہ وہ لکھتا ہے:

''بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی چیز کی قدر اس محنت کے اندازے سے مقرر ہوگی جو اس کے بنانے پر صرف ہوئی ہے تو ایک کاہل اور پھوہڑ آدمی کی بنائی ہوئی چیز زیادہ قیمتی ٹھہرے گی کیونکہ وہ اس کے بنانے پر زیادہ وقت صرف کرے گا۔ یہ اعتراض بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے تم یاد کرو کہ میں نے ، سماجی محنت ، کا لفظ استعمال کیا تھا۔لفظ، سماجی کی شرط میں بہت سے نکتے پوشیدہ ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کسی

کموڈٹی کی قدر اس محنت کی مقدار سے جو اس کے بنانے میں صرف ہوئی ہے۔ متعین ہوگی تو اس محنت سے ہم وہ خاص محنت اور اس کی وہ خاص مقدار مراد لیتے ہیں جو سماج کی خاص حالت میں ایک اوسط درجے کی سماجی رفتار سے صرف کی جاتی ہے، اور اس کو ایک اوسط درجے کی مہارت والا مزدور صرف کرتا ہے۔''

اجرت پر کام کرنے والا مزدور سرمایہ دار سماج آزاد فرد سمجھا جاتا ہے۔ وہ عہد غلامی کی طرح کسی مالک کی ملکیت نہیں ہوتا۔ وہ قرون وسطیٰ کے سرف کی طرح اپنی زمین کے ساتھ بندھا ہوا بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ سرمایہ داری دور کا مزدور اپنے کو سرمایہ دار کے ہاتھ بیچ نہیں ڈالتا۔ اگر یہ صورت ہوتی تو وہ غلام ہو جاتا۔ لیکن وہ اپنی ایک کموڈٹی جو اس کے پاس باقی رہ گئی ہے یعنی محنت کرنے کی صلاحیت اور طاقت، وہ اسے فروخت کرتا ہے۔ اس پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے مارکس لکھتا ہے :

''اپنے روپئے کو سرمایہ میں تبدیل کرنے کے لیے روپئے کے مالک کو بازار میں آزاد مزدور ملنے چاہئیں۔ یہ مزدور دو حیثیتوں سے آزاد ہونے چاہئیں۔ پہلی بات تو یہ تو یہ ہے کہ آزاد فرد کی حیثیت سے فروخت کرنے کی آزادی رکھتے ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کے پاس اپنی محنت کے سوا کوئی دوسری چیز ایسی نہ ہو جسے وہ بازار میں فروخت کر سکیں، تاکہ ان کی محنت کرنے کی پوری طاقت خریدی جا سکے۔''

اس ضمن میں ایک اور سوال اُٹھتا ہے کہ اس آزاد مزدور کو اپنی محنت جو کموڈٹی میں تبدیل ہو چکی ہے اس کو کس قیمت پر فروخت کرنا چاہیئے ؟ یعنی مزدور کی محنت کرنے کی طاقت کی قیمت کیا ہے؟ محنت کرنے کی قیمت بھی دوسری تجارتی اشیاء کی قیمتوں کی طرح محنت کی اس مقدار پر منحصر ہے جو اس کو پیدا کرنے کے لیئے ضروری ہے۔ دوسرے الفاظ میں مزدور کی محنت کی طاقت برابر ہے ان تمام چیزوں کے جو اس کے اور اس کے خاندان کے زندہ رہنے کے لئے ضروری ہیں تاکہ محنت کی طاقت ورسد برابر جاری رہے۔ اب مختلف خطوں اور ملکوں میں زندہ رہنے والی اشیاء کی قیمتیں چونکہ مختلف ہیں اس لئے مختلف ملکوں میں مزدوروں کی اجرتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ بہرحال مارکس کے نزدیک مزدور کی اجرت ہمیشہ اس رقم کے برابر ہوتی ہے جس سے مزدور وہ چیزیں خرید سکے جو اس کی اور اس کے بیوی بچوں کی بقا کے لئے ضروری ہوں۔ مارکس اپنے نقطۂ نظر کی تصریح اس طرح کرتا ہے:

''محنت کی طاقت کی قیمت وہی ہے جو ان چیزوں کی مجموعی قیمت ہے جو مزدوروں کے زندہ رہنے کے لیے ضروری ہیں۔ تا کہ محنت کو قائم اور باقی رکھا جا سکے۔ اس کی روزی کے ذرائع اتنے کافی ہونے چاہئیں کہ وہ اپنی ذات کو ایک محنت کرنے والے فرد کی حیثیت سے معتدل حالت میں باقی رکھ سکے۔ اس کی قدرتی ضرورتیں، غذا کپڑے، ایندھن اور مکان وغیرہ، آب و ہوا اور ملک کے طبعی حالات کے بموجب بدلتی رہتی ہیں۔ یہ بھی ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ مزدور کی مفروضہ ضرورتوں کی تعداد اور وسعت تاریخی ارتقاء کی پیداوار ہیں۔ اس لئے بڑی حد تک ان تمام چیزوں کا دارومدار بھی اس ملک کے تہذیبی درجے، وہاں کے رہنے والوں کی عادتوں اور آرام و آسائش کے اس معیار پر ہوگا جو وہاں کے باشندوں نے اپنایا ہے جن کے درمیان اس آزاد مزدوروں کے طبقہ نے جنم لیا ہے۔

محنت کی طاقت کا مالک بھی فانی وجود رکھتا ہے۔ اس لئے جب یہ طاقت گھس گھسا کر یا موت کے ہاتھوں بازار میں آنے کے قابل نہ ہو تو اس کی جگہ دوسری تازہ دم طاقت جو کم سے کم پہلی طاقت کے مساوی ہو اس کو بھرتی کر لیا جاتا ہے۔ اسی لئے اس معاش کے ذرائع کا بھی شامل ہونا ضروری ہے جو اس طاقت کے بدل یعنی اس کے بچوں کے زندہ رہنے کے لیے ضروری ہوں تا کہ اس عجیب سی کموڈٹی کے مالکوں کی نسل اپنا وجود بازار میں قائم رکھ سکے۔''

مارکس کی تشریح کے پورے معانی پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ مزدوروں کی اجرت مختلف ملکوں میں مختلف ہوگی کیونکہ ان ملکوں میں صرف ہونے والی اشیائے خوردنی کی قیمتوں میں ہی فرق نہیں ہوتا بلکہ ان ملکوں کے معیار زندگی میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مثلاً جن ملکوں میں سینما، ٹیلی ویژن، ریفریجریٹر معمول کی زندگی کا حصہ بن چکے ہیں وہاں پر مزدور کی اجرتوں میں ان اشیاء کا استعمال کی قیمتوں کو اجرتوں میں شامل کرنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے بین الاقوامی سرمایہ دار اپنے کارخانہ پسماندہ ملکوں میں لگانے کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ ان کو وہاں سستی لیبر حاصل ہو سکتی ہے اور سستی لیبر وہاں اس لئے ہوتی ہے کہ ان ملکوں میں ٹیلی ویژن ریفریجریٹر وغیرہ کے استعمال اتنا عام نہیں ہوا ہے جتنا صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملکوں میں۔

مارکس جو مزدوروں کو ''عجیب سی کموڈٹی کے مالکوں کی نسل'' کہتا ہے تو اس کا کیا مطلب

ہے؟ مزدور کی محنت عجیب کموڈٹی اس لئے ہے کہ یہ اپنی قدر سے زیادہ قدر پیدا کر سکتی ہے۔ مزدور جب اجرت پر کام کرتا ہے تو یہ صرف اپنی اجرت کے برابر قدر ہی پیدا نہیں کرتا جو وہ بہت تھوڑے سے وقت میں پیدا کر سکتا ہے، بلکہ کام کے پورے دن وہ اپنی محنت کا عمل جاری رکھتا ہے۔ اگر کام کا دن دس گھنٹوں پر مشتمل ہے اور مزدور اپنی اجرت کے برابر قدر صرف چھ گھنٹے میں پیدا کر لیتا ہے تو یہ باقی چار گھنٹے اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے مالک کے لیے کام کرتا ہے۔ پہلے چھ گھنٹوں کو مارکس ''ضروری محنت کا وقت،، قرار دیتا ہے اور باقی چار گھنٹوں کو ''زائد محنت کا وقت'' کہتا ہے۔، اس دس گھنٹوں کی مجموعی پیداوار کا 6/10 حصہ تو مزدور کی اجرت کے مساوی ہے اور باقی 4/10 حصہ ''قدر زائد'' (surplus value) ہے جو مالک ہتھیا لیتا ہے اور اس کے نفع کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہی قدر زائد سرمایہ داری نظام میں جاری محنت کی لوٹ کا بنیادی پیمانہ ہے۔

ویسے قدر زائد کے حوالے سے سرمایہ داری نظام میں خفیہ لوٹ کی نشاندہی کرنے والا شخص صرف مارکس ہی نہیں تھا۔ اسی دور میں امریکہ کا نامور قائد ابراہام لنکن بھی اسی قسم کی باتیں کر رہا تھا۔

> ''ہمارے فائدہ کی کوئی ایسی چیز نہ کبھی تھی نہ ہوگی جس پر پہلے محنت خرچ نہ کی گئی ہو۔ اور چونکہ ہمارے فائدہ کی چیزوں میں زیادہ تر محنت کی پیداوار ہوتی ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس قسم کی سب چیزوں کی ملکیت کا حق ان کو پہنچتا ہے جن کی محنت نے ان کو بنایا ہے۔ لیکن دُنیا کے سارے زمانوں میں ایسا ہوا ہے کہ کچھ لوگوں نے محنت کی ہے لیکن اس محنت کے پھل کے بیشتر حصہ سے فائدہ اُٹھایا ہے ان لوگوں نے جنہوں نے کوئی محنت نہیں لگائی۔ یہ انصاف نہیں، اور اس صورت حال کو جاری نہیں رہنا چاہیئے۔ یہ بندوبست کرنا کہ ہر محنت کش کو اس کی محنت کا پورا پھل ملے، یا اتنا قریب قریب پورا ملے جتنا ممکن ہو، یہ ہر حکومت کیلئے ایک قابل قدر نصب العین ہے۔''

یہ ابراہم لنکن کے خیالات تھے۔ اس کے آخری جملے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ صورت حال کی درستی کے لئے اقدام کا بھی خواہشمند تھا۔ یوٹوپیائی سوشلسٹ اور مارکس بھی چاہتے تھے کہ اس سلسلے میں اقدام اُٹھائے جائیں۔ لیکن مارکس جس قسم کے اقدام کی ضرورت محسوس کرتا تھا وہ

MashalBooks.com

دوسرے سوشلسٹوں سے مختلف تھا۔ چنانچہ مارکس اور اس کے دوست فریڈرک اینگلز نے کمیونسٹ مینی فیسٹو میں، جو 1848 میں تحریر کیا تھا تصوراتی نظریہ سازوں کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھا تھا:

''یہ لوگ سماج کے ہر ممبر کی حالت بہتر کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی نگاہ کرم سے جو زیادہ خوش قسمت لوگ ہیں وہ بھی محروم نہیں ہیں۔ اس لئے وہ عادتاً پورے سماج سے طبقات کے فرق کا لحاظ کئے بغیر اپیل کرتے ہیں۔ ان کے مخاطب بھی زیادہ تر حاکم طبقے ہی کے لوگ ہوتے ہیں۔ جب عوام ان نظام اور طریق کار سے اچھی طرح واقف ہو جاتے ہیں تو ان کو اندازہ کرنے میں دشواری نہیں ہوتی کہ یہ لوگ کتنی اچھی تجویزیں رکھتے ہیں اور ان تجویزوں کے ذریعے کتنے اچھے سماج کے وجود میں آنے کا امکان ہے۔ یہ لوگ تمام سیاسی اور خاص طور پر انقلابی تحریکوں کے مخالف ہیں۔ یہ امن اور شانتی سے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے تجربوں کے ذریعے سے جن کا ناکام ہونا بالکل یقینی ہے، نئے سماجی مذہب کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ ابھی تک اپنی مفروضہ سماجی جنتوں کا کو خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ اُمید کرتے ہیں کہ ان خوابوں کی کوئی تعبیر نکل آئے گی اور وہ دُنیا سے دور اپنی آئیڈیل نو آبادیاں بسا سکیں گے۔ وہ ان ہوائی قلعوں کی تعمیر کے لئے بورژوا جماعتوں اور ان کے خزانوں سے اپیل کرتے ہیں۔''

مارکس اور اینگلز کی تعلیمات کا بنیادی نکتہ ہی یہ تھا کہ سرمایہ دار طبقے جو حکومت پر قابض ہیں ان سے رحم دلی کی درخواستوں اور اپیلوں کے ذریعہ کبھی بھی گوہر مراد حاصل نہ ہوگا۔ چنانچہ اُنہوں نے 1879 میں جرمن ریڈکل لوگوں کو اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا:

''ہم چالیس سال سے طبقاتی کشمکش کو تاریخ کی فعال محرک طاقت بتاتے آئے ہیں۔ ہم خاص طور سے موجودہ سماجی انقلاب کے لیے بورژوا اور پرولتاری طبقوں کی کشاکش کو بڑا اہم محرک سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہم ان لوگوں سے کسی قسم کا تعاون نہیں کر سکتے جو اس طبقاتی کشمکش کو تحریک سے خارج کر دینا چاہتے ہیں۔ جب مزدوروں کی بین الاقوامی مجلس ''انٹرنیشنل'' قائم ہوئی تھی تو ہم نے صاف طور پر اپنا یہ نعرہ جنگ مقرر کیا تھا کہ محنت کشوں کی نجات محنت کشوں ہی کے ہاتھوں ہوگی۔ اس لئے ہم ان لوگوں سے اشتراک عمل نہیں کر سکتے جو یہ کہتے ہیں کہ مزدور غیر تعلیم یافتہ

ہیں۔ اس لئے وہ اپنی نجات کا موجب نہیں ہوسکتے اور ان کی گلوخلاصی کے لیے ضروری ہے کہ پہلے انسانیت نواز اور کم حیثیت کے بورژوا ان کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھائیں۔

مارکس اور اینگلز نے سوشلزم کی تعلیمات میں ایک نئے عنصر کو شامل کیا تھا۔ وہ عنصر تھا طبقاتی کشمکش اور اسی کو وہ تاریخ کی قوت محرکہ گردانتے ہیں۔ ان کی نظر میں تاریخ اتفاقات کا نتیجہ نہیں تھی، نہ ہی یہ خیالات کے ذریعہ تبدیل ہوتی ہے۔ تاریخ کو حرکت میں لانے والی قوت معاشیات سب سے اہم قوت ہے، یہ اکیلی قوت نہیں جو تاریخ کو آگے بڑھاتی ہے۔ معاشیات، سیاسیات، قانون، مذہب اور تعلیم، تہذیب کی یہ تمام شاخیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں اور اپنے وجود کے لیے ایک دوسرے پر انحصار کرتی ہیں ان میں سے ہر شاخ کی خصوصیت کا تعین دوسری شاخوں کے حوالے سے ہوتا ہے۔ بہرحال معاشیات ان سب قوتوں میں سب سے اہم قوت ہے۔ انسانوں کے درمیان معاشی پیداوار کرنے والوں کی حیثیت سے جو رشتہ ہوتا ہے وہ معاشرے کے سارے ڈھانچہ کیلئے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان جن طریقوں سے اپنی روزی پیدا کرتے ہیں وہ اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ ان کی زندگی کے دوسرے انداز کس طرح کے ہوں گے۔ دوسرے الفاظ میں۔ معاشرہ کس قسم کا ہوگا اسکا تعین معاشرے میں رائج پیداواری طریقوں (modes of production) سے ہوتا ہے۔

مارکس اس پورے عمل کی تشریح یوں کرتا ہے۔

''میں بڑے گہرے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آئینی تعلقات اور ریاست کی شکلیں نہ اپنی جگہ پر سمجھی جاسکتی ہیں اور نہ انسانی دماغ کی نام نہاد ترقی کے سہارے ان کی تشریح ہی کا کوئی امکان ہے۔ ان کی جڑ انسانی زندگی کے مادی حالات میں پوشیدہ ہے۔ سماجی پیداوار کے ذریعے سے لوگ آپس میں رشتے پیدا کرتے ہیں۔ کسی مخصوصی دور میں مادی پیداوار کی طاقتیں جس سٹیج پر پہنچ چکی ہوتی ہیں، پیداواری رشتے انہیں سے مطابقت اختیار کرتے ہیں۔ پیدوار کے انہیں تعلقات کی مجموعی مقدار سماج کا معاشی تانا بانا تیار کرتی ہے۔ اسی کی بنیاد پر آئینی اور سیاسی عمارتیں کھڑی ہوتی ہیں اور سماجی بیداری کی مختلف شکلیں اس سے مطابقت پیدا کرتی ہیں۔ مادی دُنیا کی پیدوار کا ڈھنگ ہی سماجی، سیاسی اور روحانی عمل کا عام

کردار متعین کرتا ہے لوگوں کا شعور ان کے سماجی وجود کا باعث نہیں ہوتا بلکہ اس کے بالکل برعکس ان کا سماجی وجود ان کے شعور کا تعین کرتا ہے۔''

مارکس کا یہ فلسفہ محروم طبقوں کے ہاتھ میں ایک ایسا آلہ دے دیتا ہے جس کی مدد سے ہم تاریخ کی بڑی نتیجہ خیز تشریح کر سکتے ہیں۔ ہر سماج کی بنیاد اس طریقے پر قائم ہے جس کے ذریعے انسان اپنی روزی پیدا کرتے ہیں۔ دولت کی تقسیم کس طرح عمل میں آتی ہے اور سماج کس طرح طبقوں میں بٹتا ہے اس کا انحصار اس پر ہے کہ کیا پیدا ہوا ہے، اور کیونکر پیدا ہوا ہے، اور پیداوار کا مبادلہ کس طرح عمل میں آیا ہے۔ اسی طرح حق، انصاف اور تعلیم وغیرہ کے تصورات اور نظریات معاشی اور اتفاقی اس خاص منزل کیلئے موزوں ہوتے ہیں جہاں کوئی خاص سماج پہنچ چکا ہوتا ہے۔ پھر وہ کیا عوامل ہیں جو سماجی اور سیاسی انقلاب برپا کرتے ہیں؟ کیا یہ تبدیلیاں ان تغیرات کی وجہ سے ہوتی ہیں جو لوگوں کے خیالات میں پیدا ہوتے رہتے ہیں؟ حقیقت یہ نہیں ہے۔ لوگوں کے خیالات میں تغیرات تو ان تبدیلیوں کی وجہ سے ہوتے ہیں جو معاشیات میں، یعنی پیداواری اور مبادلے کے طریقوں میں اس سے پہلے ہی ہو جاتے ہیں۔

انسان قدرت کو اپنے قابو میں لانے کے عمل کے ذریعہ ترقی کرتا رہتا ہے پیداوار کے نت نئے طور طریقے اور مبادلہ اشیاء کے جدید طریقے دریافت اور ایجاد ہوتے رہتے ہیں۔ جب یہ تغیرات بنیادی نوعیت کے ہوں اور ایسے ہوں جن کے اثرات دوروس ہوں تو سماجی تصادم پیدا ہوتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ پرانے نظام پیداوار کی بنا پر جو رشتے اور رابطے پیدا ہوئے تھے وہ اپنی جگہ اٹل ہو گئے ہوتے ہیں۔ زندگی کے پرانے رشتے قانون، سیاست، مذہب اور تعلیم کے ذریعہ ایک ساکت اور مستقل صورت اختیار کر چکے ہوتے ہیں۔ جو طبقہ سماج میں پہلے سے طاقتور ہوتا ہے وہ اپنی طاقت کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اور اس طرح وہ اس طبقے سے ٹکراتا ہے جو بدلتے ہوئے پیداواری طریقوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے اس کشاکش کا نتیجہ انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

چونکہ مارکس اور اینگلز نے ماضی کی تاریخ کا مطالعہ معاشی نقطۂ نظر سے کیا تھا اس لئے ان کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ وہ بورژوا طبقے کا صحیح تاریخی مقام متعین کر سکیں۔ انہوں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ سرمایہ داری بری ہے اور سرمایہ دار لوگ بدمعاش ہوتے ہیں۔ اُنہوں نے صرف یہ پتہ لگایا کہ سرمایہ داری نظام کس طرح اس سے پہلے والے معاشی حالت کے بطن سے پیدا ہوا۔ اُنہوں

نے بورژوا طبقے کے انقلابی کردار کے تذکرے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ وہ ان کی اس انقلابی کشاکش کا کمال فیاضی سے تذکرہ کرتے ہیں جو اُنہوں نے جاگیرداری نظام کے خلاف اپنے عروج کے زمانے میں کی تھی۔

جاگیرداری نظام سرمایہ داری نظام کے سامنے راستہ چھوڑنے پر صرف اس لئے مجبور ہوا تھا کہ نئی پیدا کرنے والی طاقتیں اور ایک انقلابی بورژوا طبقہ دونوں وجود میں آچکے تھے۔ ایسا ہی ہمیشہ ہوتا ہے۔ پرانا نظام صرف اس لئے نئے نظام کے لئے جگہ نہیں چھوڑتا کہ لوگ اس کے آرزومند ہوتے ہیں بلکہ اس تبدیلی کے لئے پہلی شرط ہی یہ ہے کہ پیداوار کے نئے ذرائع اور ان سے کام لینے والے پیدا ہو جائیں اور ایک انقلابی طبقہ بھی وجود میں آجائے جو ان طاقتوں کو سمجھ کر راہ پر لگا سکے۔ یہی وہ وجود تھے جنہوں نے جاگیرداری نظام کو ختم کر کے سرمایہ داری کے لیے جگہ بنائی۔

مارکس اور اینگلز نے سرمایہ داری سماج کا تجزیہ کرتے ہوئے ان عوامل کی نشاندہی بھی کی تھی جو خود سرمایہ داری نظام کے اندر موجود ہیں اور جو بالآخر اس نظام کی تباہی کا موجب ہوں گے:

1۔ دولت کا چند آدمیوں کے ہاتھوں اکٹھا ہونا

2۔ چند بڑے سرمایہ داروں کو چھوٹے سرمایہ داروں کی خاصی بڑی تعداد کو کچلنا۔

3۔ مشینوں کا بڑھتا ہوا استعمال اور مزدوروں کی بہت بڑی تعداد کی بے روزگاری اور اس طرح صنعتی مزدوروں کے ایک مستقبل لشکر کی تشکیل پانا۔

4۔ عوام کی بڑھتی ہوئی پریشانی۔

5۔ اس نظام میں مسلسل بحرانوں کا پیدا ہوتے رہنا۔

لیکن ان سب سے زیادہ اہم وہ بنیادی تضاد ہے جس کی رو سے پیداوار تو زیادہ سے زیادہ مشترکہ یعنی socialized ہوتی جاتی ہے۔ لیکن اس پیداوار پر قبضہ نجی اور انفرادی ہوتا ہے۔ اس پورے عمل کی وضاحت مارکس اپنی تصنیف کیپٹل میں کرتا ہے وہ لکھتا ہے۔

''ایک سرمایہ دار ہمیشہ بہت سے سرمایہ داروں کے قتل کا سبب بنتا ہے۔ جب دولت ان چھوٹے سرمایہ داروں کے خاتمے کے بعد صرف چند اشخاص کے ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جاتی ہے تو تیزی سے وسیع سے وسیع تر پیمانے پر محنت کا عمل اشتراک

باہمی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ محنت کے ذرائع اپنی شکل بدل کر محنت کے ایسے ذرائع بن جاتے ہیں جن کو صرف مشترکہ طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے سرمایہ داروں کی تعداد بھی گھٹتی رہتی ہے اور پریشان حالی، تباہی غلامی، پسماندگی اور لوٹ کھسوٹ کا حلقہ بڑھتا رہتا ہے۔ ان حالات میں محنت کشوں کی بغاوت بھی پھیلتی جاتی ہے۔ یہ بغاوت متفق اور منظم ہوتی ہے اور اس کی تنظیم بھی اسی سرمایہ داری پیداوار کے عمل کے ذریعے سے مکمل ہوتی ہے۔ سرمائے کی اجارہ داری پیداواری کے ڈھنگ پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کو بڑھنے سے روکتی ہے۔ پیداوار کے ذرائع صرف ایک جگہ مرکوز ہو کر رہ جاتے ہیں، لیکن محنت اشترا کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ دونوں اس حالت میں عرصے تک اکٹھا نہیں رہ سکتے۔ اور ایک وقت آ جاتا ہے کہ بندٹوٹ جاتے ہیں اور سرمایہ داری کی نجی املاک کی فاتحہ پڑھ دی جاتی ہے۔ وہ لوگ جو اب تک غصب کرتے آئے تھے وہ اب خود غصب کر لئے جاتے ہیں۔''

ہم نے یہاں مارکس کی تعلیمات کا اجمالا ذکر کر دیا، لیکن کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز ایسے فلسفی، ایسے ماہر معاشیات تھے جو صرف خالی خولی فلسفہ ہی نہیں بیان کرتے تھے بلکہ وہ سرمایہ داری سماج کو تبدیل کر کے ایک کمیونسٹ سماج میں ڈھالنے کے لیے مستقل مصروف جہد میں بھی رہتے تھے۔ وہ مرد میدان تھے اور مارکس نے اپنی پوری زندگی اپنے اعتقادات کو روبہ کار لانے کے لئے وقف کر دی تھی۔ مارکس نے یہ بات بخوبی سمجھ لی تھی اور اس پر اس کا پختہ یقین تھا کہ سرمایہ داری کا زوال محنت کش عوام کے ہاتھوں ہوگا۔ اس لئے مارکس اور اینگلز دونوں ٹریڈ یونینوں کی اہمیت کے بہت قائل تھے اور ان کی تنظیم پر بہت زور دیتے تھے:

''مزدوروں کی ایک طبقے کی حیثیت سے تنظیم ٹریڈ یونینوں کے ذریعے ہی عمل میں آتی ہے اور ٹریڈ یونینیں ہی محنت کشوں کا وہ ادارہ ہیں جن کے ذریعے وہ اپنی روزمرہ زندگی میں سرمائے کے خلاف کشمکش جاری رکھتے ہیں۔ اس طرح محنت کشوں کی تربیت ہوتی ہے۔''

مارکس اور اینگلز نے اپنے فکر اور مسلسل جدوجہد سے یہ محسوس کر لیا تھا کہ سرمایہ داری نظام کا خاتمہ قریب ہے۔ اگر اس نظام کے خاتمے کے وقت محنت کش طبقے ذمہ داری سنبھالنے کے

MashalBooks.com

لیے تیار نہ ہوئے تو سخت بدنظمی پھیل جائے گی اور اگر محنت کشوں نے اپنی تیاری کا ثبوت دیا تو اشتراکیت کی بنیادیں قائم ہو جائیں گی اور اس وقت بقول مارکس

''تاریخ میں پہلی مرتبہ انسان حیوانی مملکت سے نکل کر اپنا انسانی امتیاز حاصل کرے گا اور زندگی کی حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی عظمتوں کا حقدار بن سکے گا۔ اسی وقت انسان سوچ سمجھ کر اپنی تاریخ بنا سکے گا اور یہی وہ شاہراہ ہے جو انسان کو مجبوریوں کی تنگ وادیوں سے نکال کر آزادی کی مملکت کی طرف لے جائے گی۔''

MashalBooks.com

انیسویں صدی کے لندن میں چہل پہل۔ سرمایہ داری نظام اپنے عروج پر ہے۔

MashalBooks.com

ترقی کی دیوی ایک ہاتھ میں سکول کی کتاب سنبھالے، دوسرے ہاتھ میں ٹیلیگراف کا
تار لئے اپنے سامنے اندھیرے کو بھینسوں کو اور انڈینز کو بھگاتی جا رہی ہے نیچے سفید فام آبادکار
زمین پر پھیل رہے ہیں (امریکی پینٹنگ 1872)

MashalBooks.com

18

ٹرسٹ اور کارٹیل سے سامراج تک

صنعتی انقلاب کے شروع کے دور میں کلاسیکی ماہرین معاشیات نے محنت کے حوالے سے معاشی قدر کی جو تھیوری (The Lahbour Theory of Value) پیش کی تھی وہ بہت مفید ثابت ہوئی تھی۔ ترقی یافتہ بورژوا طبقے کے ہاتھوں میں یہ ایک ہتھیار بن گیا جس کی مدد سے اس نے رجعت پسند لیکن سیاسی طور پر طاقتور زمیندار طبقے پر فتح حاصل کی، کیونکہ اس تھیوری نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ یہ طبقہ بغیر محنت کئے زندگی کا لطف اُٹھاتا ہے۔

جب تک یہ ہتھیار بورژوا طبقے کے ہاتھوں میں تھا اس میں ساری اچھایاں نظر آ رہی تھیں۔ لیکن جب یہ مارکس کے ہاتھوں میں پہنچا تو اب اس میں خرابیاں ہی خرابیاں نظر آنے لگیں۔ مارکس نے بورژوا ماہرین معاشیات کے اس نظریئے کو اپنا کر کہ معاشی قدر (دولت) محنت سے پیدا ہوتی ہے، اس کا منطقی نتیجہ یہ نکالا تھا کہ صنعتی دور میں سرمایہ مزدور کی محنت سے پیدا ہوتا ہے اور اس لئے اس پر مزدوروں کا حق ہے۔ اس سے سرمایہ دار طبقے میں کھلبلی مچ گئی۔ جس ہتھیار پر اب تک ان کا دارومدار تھا اب وہی ہتھیار پرولتاری (مزدور طبقہ) انہی کے خلاف استعمال کر رہے تھے!

چنانچہ مارکس کی تصنیف کیپٹل اشاعت کے چند سال بعد ماہرین معاشیات نے ایک بالکل ہی مختلف نظریہ قدر پیش کیا۔ تین ماہرین معاشیات یورپ کے تین مختلف ممالک میں پیدا ہوئے تھے۔ اسٹینلے جیونز (Stanley Jevons) انگلستان میں 1781 میں، کارل منیجر (Karl Menger) آسٹریا میں (اس کا سال پیدائش بھی 1871 ہی ہے) اور لیون والرس (Leon Walras) سوئزرلینڈ میں 1874 میں۔ یہ ماہرین گو ایک دوسرے سے الگ الگ اپنی تحقیقات میں معروف تھے لیکن حسن اتفاق سے سب تقریباً ایک ہی وقت میں ایک ہی نتیجہ پر پہنچے۔ اُنہوں نے جو سادی سی چیز دریافت کی وہ یہ تھی کہ کسی چیز کی قدر اس کی افادیت پر ہوتی ہے۔ یہ نظریہ ''مارجنل یوٹیلٹی'' (Marginal Utility) کے نام سے مشہور ہوا۔ ان معاشی ماہرین کا اصرار تھا کہ جس چیز کی جتنی ضرورت ہوگی اتنی ہی اس کی افادیت ہوگی اور یہی چیز اس کی قیمت مقرر کرے گی۔ اس موقف نے معاشی نظریئے کا سارا زور پیداوار سے ہٹا کر استعمال پر اور کوسٹنگ

ڈیپارٹمنٹ سے بازار کی طرف منتقل کر دیا۔

بہر حال سرمایہ داروں نے یہ بات اچھی طرح محسوس کر لی تھی کہ اگر وہ چیزوں کی سپلائی پر کنٹرول کر سکیں تو وہ ان کی قیمتوں پر بھی قابو رکھ سکتے ہیں۔ کسی چیز کی پیداوار پر اگر کم وقت صرف ہوا ہو یا اس کی تعداد میں اضافہ ہوا ہو تو اس کی قدر کم ہو سکتی ہے، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر بازار میں اس چیز کی سپلائی کو کنٹرول کیا جائے تو قیمتوں کے تقرر کا اختیار سرمایہ دار کے ہاتھ میں رہتا ہے۔

سرمایہ دار تجارت یا مصنوعات پر اپنی اجارہ داری سے فائدہ اُٹھا کر بازار میں چیزوں کی قیمتیں کس طرح اپنی مرضی سے فکس کرتے ہیں، یہ طریقہ کار بہت پرانا ہے۔ چار سو سال پہلے سولہویں صدی میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی، ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی اور پرتگیزیوں کی تجارتی کمپنی اور فرانسیسی تجارتی کمپنیاں عالمی تجارت کی دوڑ میں مصروف تھیں اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کیلئے دن رات ایک کر رہی تھیں تو ڈچ تاجروں نے مسالوں کی پیداوار صرف اس لئے گھٹا دی تھی کہ ان کی قیمتیں بڑھائی جا سکیں۔ دراصل تجارت میں ایک لڑائی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ جب دو کمپنیاں ایک خاص تجارت میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتی ہیں تو ایک کمپنی دوسری کمپنی کو نقصان پہنچانے کے لیے اپنی مصنوعات کی قیمت گرا دیتی ہے۔ اس طرح سے دوسری کمپنی بھی قیمتیں پہنچانے کے لیے اپنی مصنوعات کی قیمت اصل لاگت سے بھی کم سطح پر آجاتی ہیں۔ اب اس مقابلے کے آخری دور میں وہی جیتے گا جس کے پاس وافر اور محفوظ سرمایہ ہوگا۔ مارکس بڑے سرمایوں کا ٹکراؤ بار بار دیکھ چکا تھا۔ چنانچہ وہ اس ضمن میں لکھتا ہے:

> ''مقابلے (Competition) کی لڑائی چیزوں کی قیمتیں کم کر کے لڑی جاتی ہے۔ قیمتوں کی کمی لیبر کی قوت پیداوار پر منحصر ہے اور یہ خود اس بات پر کہ پیداوار کتنے بڑے پیمانے پر ہو رہی ہے۔ اس لئے بڑا سرمایہ (جو زیادہ بڑے پیمانے پر پیداوار کر سکتا ہے) چھوٹے سرمائے کو شکست دے دیتا ہے۔''

ان آزاد مقابلوں نے اگے بڑھ کر ٹرسٹوں کی شکل اختیار کر لی۔ ٹرسٹ سازی کے فن کے ماہر جون، ڈی روکافیلر نے جو سب سے بڑے ٹرسٹ کے بانی کا بیٹا تھا، مقابلے کی جنگ سے نکلنے والے خوفناک نتائج کو ان کامیابیوں کے مقابلے میں جو حاصل ہوتی ہیں، ہیچ خیال کیا۔ اس نے براؤن یونیورسٹی کے طلبا کے سامنے ٹرسٹوں کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

MashalBooks.com

''امریکہ کے گلہائے حسن و جمال کو ان کے کمال شباب تک پہنچانے کے لئے ان کلیوں کو خون کرنا ہوگا جو ان کے چاروں طرف نکل آتی ہیں۔''

پہلا ٹرسٹ امریکہ میں 1904 میں وجود میں آیا جب سٹینڈرڈ آئل کمپنی نے ملک کے چھیاسی فی صدی صاف کئے ہوئے روشنی کرنے والے تیل پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔ جو عمل تیل کے میدان میں ہوا وہی لوہے، شکر، شراب، کوئلے اور دوسری پیداواروں کے شعبوں میں بھی دہرایا گیا۔ چاروں طرف ٹرسٹ قائم ہونے شروع ہو گئے اور اُنہوں نے اجارہ داری نظام قائم کر کے مقابلے کی ہماہمی ختم کر دی ہے۔

ان ٹرسٹوں کی کارکردگی اور طاقت کی کوئی انتہا نہ تھی، اُنہوں نے پیداوار کی لاگت بھی کم کر دی اور انتظامی مصارف بھی بہت گھٹا دیئے۔ اُنہوں نے اشیاء کی پیداوار پر بھی قابو پا لیا تا کہ پیداوار کی مقدار اور اس کی قیمت کا تعین ان کے اختیار سے باہر نہ ہونے پائے اور مقدار اور قیمت دونوں جیسا موقع ہو زیادہ نفع حاصل کرنے کیلئے گھٹائی بڑھائی جا سکے۔ چنانچہ ٹرسٹوں پر تحقیق کرنے والے ایک محقق نے لکھا ہے:

''ٹرسٹ نام ہے صنعتی تنظیم کی شکل کا جو تجارتی اشیاء کی پیداوار یا تقسیم سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ تنظیم اس تجارتی چیز کی رسد پر کافی قابو رکھتی ہے تا کہ وہ اس قابل رہے کہ اس چیز کی قیمت اپنے مفاد کا پورا لحاظ کر کے مقرر کرتی رہے۔''

ٹرسٹ اس قابل ہوتا تھا کہ اشیاء کی قیمتوں میں اپنے مفاد کے لحاظ سے تغیر و تبدیل کرتا رہا۔ ٹرسٹوں کے قیام کے بعد اس قسم کے دوسرے ادارے بھی منظم ہونا شروع ہو گئے۔ ٹرسٹ کا رواج امریکہ میں شروع ہوا لیکن اس کے فوراً بعد مشترکہ سرمائے (Pools) تجارتی کمبائن (Combine) ایسوسی ایشن اور کارٹیل وغیرہ (یہ تمام اجارہ داری کی مختلف شکلیں تھیں) نہ صرف امریکہ میں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی عام ہو گئیں۔

کارٹیل کا رواج جرمنی میں خاص طور پر زور پکڑ گیا۔ کارٹیل سے ایک ایسی انجمن مراد تھی جس میں بہت سے تاجر، جو ایک ہی طرح کی اشیاء کی تجارت کرتے تھے، ایک معاہدے کے تحت آپس میں شامل ہو جاتے۔ وہ اپنے کاروبار کے معاملے میں اپنی جگہ پر بالکل آزاد اور خود مختار ہوتے تھے اور آپس میں متحد ہو کر بازار کے اوپر اپنا اجارہ دارانہ اقتدار قائم کر لیتے تھے اور مشترکہ فیصلوں کے ذریعہ بازار میں چیزوں کی قیمتوں کا تقرر کرتے تھے۔

MashalBooks.com

جرمنی کے شہر روھر جو کوئلے کی پیداوار کے لیے مشہور تھا وہاں روھر کول کارٹیل (Ruhr Coal Cartel) وجود میں آیا اس کے قیام اور کارکردگی پر ایک رپورٹ میں کہا گیا:

''ایک مرکزی سنڈیکیٹ جس کے سپرد پیداوار کی فروخت کا کام ہوتا تھا قائم کیا گیا۔ مختلف کمپنیاں اس کی حصہ دار ہوتی تھیں۔ یہ سنڈیکیٹ کوئلے کی فروخت کے لئے سول ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتی تھا۔ یہ کوئلے کی مختلف کمپنیوں سے اعداد شمار طلب کرتا تھا اور ایک انتظامیہ جماعت کی تشکیل کر کے اور قیمتوں کا ایک یکساں معیار قائم کر کے کوئلے کی فروخت اور قیمتوں کی ادائیگی کا خاص بندوبست کرتا تھا۔ کوئلے کی کانوں کے مالک اپنا تمام کوئلہ سنڈیکیٹ کے ہاتھ فروخت کرتے۔ سنڈیکیٹ معاہدوں کی خلاف ورزی کے لئے جرمانے عائد کرتا اور ایک عام پالیسی کا نفاذ کرتا۔ یہی سنڈیکیٹ ایک کمیشن کا بھی تقرر کرتا تھا جو یہ طے کرتا تھا کہ ہر کان مجموعی طور پر کتنی پیداوار برآمد کرے گی۔ یہ کمیشن کم سے کم قیمت فروخت مقرر کرتا اور ان تمام اضلاع میں جہاں مقابلہ جاری رہتا یہی شرح قائم رہتی۔ لیکن جہاں مقابلہ ہوتا تھا وہاں اس کی قیمت طلب رسد اور پیداوار کے تقاضے کے بموجب مقررہ قیمت سے گھٹتی بڑھتی رہتی۔''

انگلستان میں بھی مختلف صنعتوں میں مقابلہ کم کرنے کے لیے انجمنیں قائم کرنے کا رجحان شروع ہو گیا تھا تا کہ صنعت کاروں میں آپس میں جو کشاکش جاری رہتی تھی اس کا خاتمہ کیا جا سکے۔ چنانچہ اس سلسلے میں جو ٹرسٹ قائم ہوئے ان کی کارکردگی جاننے کے لیے پارلیمنٹ کی ایک کمیٹی نے مختلف گواہوں کی شہادتوں کی سماعت کے بعد اپنی رپورٹ میں کہا:

''آجکل 1919 میں برطانیہ میں قریب قریب صنعت کی ہر شاخ میں انجمنیں قائم کرنے اور متحدہ ادارے بنانے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ ان انجمنوں اور اداروں کا اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں کہ تجارتی مقابلے پر پابندی عائد کر کے قیمتوں کو اپنی مرضی سے بڑھایا گھٹایا جائے۔''

چنانچہ کارٹیل، سنڈیکیٹ اور ٹرسٹوں کے وجود کا واحد مقصد مقابلے پر پابندی اور قیمتوں پر قابو پانا تھا۔ لیکن ایڈم سمتھ اور کلاسیکی معاشیات کے ماہرین کے نظریات اس نئے رجحانات سے بالکل مختلف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ صنعت کاروں اور تاجروں کا آپس میں باہمی مقابلہ اشیاء کی

قیمتوں کو ایک معقول حد تک کم کر دے گا اور یہ قیمتیں پیداوار کی لاگت سے مناسبت رکھیں گے۔ لیکن اجارہ داری کے عروج نے طلب اور رسد کے درمیان قدرتی مطابقت کا دروازہ بند کر دیا۔ اب کھلے بازار میں آزاد مقابلوں کے ذریعے قیمتوں کا تقرر خود بخود نہیں ہوتا تھا بلکہ اب قیمتیں مقرر کی جاتی تھیں۔

اس صنعتی اجارہ داری کے ساتھ ساتھ ایک دوسری اجارہ داری بھی وجود میں آنی شروع ہوگئی، یہ بنکوں کی اجارہ داری تھی۔ مارکس نے اس اجارہ داری کے متعلق بھی پیشین گوئی کر دی تھی۔''

''صنعتی پیداوار کے ساتھ ساتھ قرض کے لین دین کا (یعنی بنکوں کا) نظام ایک نئے عامل کی حیثیت سے وجود میں آ گیا ہے۔ تجاتی مقابلے کے میدان میں یہ بڑا زبردست اور نیا ہتھیار ہے۔ یہ اپنے غیر مرئی جال سے سماج کی اوپری سطح پر چھوٹی اور بڑی عوامی انجمنوں کے پاس جو کچھ تھوڑا بہت سرمایہ پھیلا پڑا ہے اسے گھسیٹ کر چند افراد کے ہاتھوں میں پہنچا دیتا ہے یا ایسے اداروں کے ہاتھوں میں دے دیتا ہے جنہیں چند سرمایہ داروں نے مل کر قائم کیا ہوتا ہے۔ یہ نظام ایک خاص قسم کی مشین ہے جو سرمایوں کو ایک مرکز پر لا کر اکٹھا کرنے کا کام کرتی ہے۔''

صنعتی کاروبار کل بھی اور آج بھی زیادہ تر قرض سے چلتے تھے۔ جو لوگ سرمایہ داروں کو مالی مدد دیتے تھے وہی لوگ اس نظام پر قابض تھے اور اقتدار اعلیٰ بھی انہی کے ہاتھوں میں تھا۔ جب چھوٹے یا بڑے صنعتی کاروبار کے مالکوں کو خواہ وہ اجارہ دار ہوتے یا نہ ہوتے اپنے کاروبار کی توسیع کے لیے سرمائے کی ضرورت ہوتی تھی تو ان کو انہیں بینکروں کے سامنے دست سوال دراز کرنا پڑتا تھا۔ جب لوگوں کی کوئی خاص جماعت کوئی کاروبار شروع کرنا چاہتی تھی۔ اور روپیہ اکٹھا کرنے کے لیے اپنا ذخیرہ فروخت کرنے کا ارادہ کرتی تھی تو اس کو بھی بینکروں کی خوشامد کرنی پڑتی تھی۔ ان بینکروں کے فرائض میں یہ بھی داخل تھا کہ اسٹاک کی نکاسی کی تدابیر بھی اختیار کریں۔

یہ بینکر روپے کی جتنی بڑی مقدار پر قابو حاصل کر سکتے ان کا اقتدار اتنا ہی زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ ہر بڑے صنعتی ملک میں منی ٹرسٹ (Money Trust) قائم ہوئے۔ اساس طرح سے صنعتی اجارہ داری کا دور اور بنکوں کی اجارہ داری کا دور دوش بدوش رواں دواں رہے ہیں۔ یہ

حقیقت کم سے کم 1911 میں امریکہ کی ریاست نیو جرسی کے گورنر وڈرو ولسن (Woodrow Wilson) کے اس بیان سے ثابت ہوتی ہے:

''اس ملک میں روپے کی اجارہ داری سب سے بڑی اجارہ داری ہے جب تک یہ باقی ہے ہماری پرانی تنوع پسندی، آزادی اور ترقی کی انفرادی قوتیں سب بیکار ہیں۔ ایک بڑی صنعتی قوم پر اس کے قرض دینے کا نظام (System of credit) حاوی ہوجاتا ہے۔ ہمارے یہاں قرض دینے کا نظام چند لوگوں کے ہاتھوں میں مرکوز ہے۔ اس لئے ہمارے تمام اعمال اور ہماری تمام تحریکیں انہی چند گنے چنے لوگوں کی مرضی کی پابند ہیں۔''

اکثر یہ بھی ہوا ہے کہ انہیں چند گنے چنے صنعتی اجارہ داروں یا بنکوں کے صدر الصدور ملکوں کی صدارتی کرسیوں پر بھی براجمان رہے ہیں۔ ان اجارہ داریوں کے ڈائریکٹروں میں باہمی اتصال پیدا کرنے والی ایسی جماعتیں ہوتی تھیں جو بنکوں کو دُنیا کے بڑے بڑے آدمیوں کو بڑے بڑے ٹرسٹوں اور عظیم الشان کارپوریشنوں کے بورڈ اوف ڈائریکٹرز میں شامل کرتی تھیں۔ ان ٹرسٹوں اور کارپوریشنوں سے ان کی دلچسپی بھی ہوتی تھی۔ اس دلچسپی کا مطلب صرف یہی تھا کہ ان بینکوں نے ان ٹرسٹوں اور کارپوریشنوں میں بڑی زبردست رقمیں لگا رکھی تھیں۔ یہ بینکران اداروں سے کچھ زیادہ قریبی تعلق نہیں رکھتے تھے مگر یہ بات بذات خود کچھ کم نہ تھی کہ وہ خزانے کے دہانے پر قابض تھے اور صنعتی مزدوروں کو ہر وقت اپنی پالیسی کا پابند بنا سکتے تھے۔ یہ حقیقت اس خط سے اچھی طرح ثابت ہوجاتی ہے جو برلن کے چار بڑے بینکوں نے 1901 میں جرمنی کے سمینٹ سنڈیکیٹ کے ڈائریکٹروں کو لکھا تھا:

''ہم کو معلوم ہوا ہے کہ آپ کی کمپنی کا آئندہ ہونے والا جلسہ عام کوئی ایسے قدم اُٹھانے والا ہے جس سے آپ کی ذمہ داریوں میں ایسے تغیرات کا امکان ہے جنہیں ہم پسند نہ کرسکیں گے۔ ہمیں بہت افسوس ہے کہ اس وجہ سے ہم قرض کی رقم جو ہم نے آپ کے لئے منظور کی ہے واپس لینے پر مجبور ہوں گے۔ اگر آپ کا جلسہ عام کوئی ایسی بات منظور نہ کرے جو ہمارے لئے قابل تسلیم نہ ہو اور ہمیں اس سلسلے میں اطمینان دلا دیا جائے کہ آئندہ بھی ایسا نہیں ہوگا تو ہمیں آپ سے نئے قرضے کے بارے میں بھی بات چیت شروع کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔''

MashalBooks.com

امریکی سپریم کورٹ کے جج جسٹس لوئی۔ ڈی۔ برینڈ یس (Louis D. Brandeis) نے 1912 میں اپنی کتاب ، دوسرے لوگوں کا روپیہ Other People,s Money) میں اس صورت حال کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

''مالی طور پر ہماری سرکار ان بنکروں کے ہاتھ میں ہے جو انوسٹمنٹ بنکرز کہلاتے ہیں۔ دوسرے بینک، ٹرسٹ اور بیمہ کمپنیاں ان بینکرز کی مقصد براری کا آلہ ہیں۔ ریلیں، ملازمتیں، اور مشترکہ سرمائے سے قائم کی ہوئی انجمنیں ان کی رعایا کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ بینکر جو دراصل صرف دلال ہیں، امریکہ کی کاروباری دُنیا پر مالکانہ شان سے قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ ان کے اثر واقتدار اور ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ عملی طور پر کوئی بڑی مہم ان کی شرکت یا منظوری کے بغیر کامیابی سے شروع نہیں کی جاسکتی۔ یہ بینکر درحقیقت بڑے قابل لوگ ہیں اور بڑی دولت کے مالک ہیں، لیکن تجارت پر ان کا اقتدار ان کی قابلیت اور دولت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد اس جتھا بندی پر ہے جس نے دولت کی وسعتیں اور اس کی ہمہ گیری ان کے ہاتھوں میں مرکوز کردی ہیں۔''

1870 کے بعد پرانے طرز کی سرمایہ داری نے یورپ میں اپنا پرانا چولا بدل لیا نئے طرز کی سرمایہ داری کا لباس زیب تین کرلیا۔ آزاد مقابلے کے طور طریقے قصہ پارینہ بن گئے اور اجارہ درانہ سرمایہ داری نیا نظام ٹھہرا۔ یہ انقلاب بہت اہم اور زبردست تبدیلیوں کو موجب بنا۔ اجارہ داری کی وجہ سے صنعتیں بہت بڑے پیمانے پر وجود میں آنے لگیں۔ لیکن چونکہ صنعت کاروں کی جس رفتار سے ترقی ہوئی اس رفتار سے عام لوگوں کی قوت خرید میں اضافہ نہیں ہورہا تھا۔ یہ صورت حال ان اجارہ داروں کے لئے دردسر کا رصورت بن رہی تھی۔ وہ صرف یہی نہیں چاہتے تھے کہ ان کے ملکوں میں ان کی فیکٹریوں میں بنائی ہوئی چیزوں کی مستقل فروخت ہوتی رہے بلکہ ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ ان کی مشینیں کبھی بند نہ رہیں اور ان کے کارخانے 24 گھنٹے رواں دواں رہیں۔ لیکن جب ان کے ملکوں کے عوام کی قوت خرید جواب دینے لگی تو پھر ملکوں سے باہر منڈیوں کی جستجو ایک لازمہ بن گئی۔

لیکن یہ منڈیاں کہاں ڈھونڈی جائیں؟ یہ اجارہ دار انگلستان کی طرح اپنا مال دوسری مالدار قوموں کے ہاتھ فروخت کرسکتے تھے لیکن ان تمام ملکوں میں حفاظتی محصولوں کی دیواریں

کھڑی ہوگئی تھیں اور ان دیواروں کے پیچھے ان ملکوں کے حریف اجارہ دار صنعت کاروں نے اپنے ملک کے بازاروں پر قبضہ جمالیا تھا۔ چنانچہ 1885 میں فرانس کے وزیراعظم ژول فیری (Jules Ferry) نے شکایت کی:

''ہماری عظیم الشان صنعتیں جس بات میں بے انتہا پیچھے ہیں وہ بازار ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ جرمنی نے اپنی سرحدوں کو بند کر رکھا ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے بیرونی مال کے خلاف حفاظتی تدابیر اختیار کر رکھی ہیں، اور اس معاملے میں ان ملکوں کی انتہا پسندی کی کوئی حد نہیں ہے۔''

چنانچہ سرمایہ کو نئے بازاروں کی تلاش ہوئی یہ بازار انہیں کہاں ملتے؟ اس سوال کا جواب تھا، نوآبادیات میں۔ یہ صنعتی دور کی نوآبادیات تھیں۔ اس سے پہلے جب جاگیرداری دور میں یورپ کے جہازراں نئی دُنیا کی تلاش میں اور بحری قزاقی کی مہم میں سرگرداں تھے تو انگلستان، فرانس، سپین اور پرتگال، اور ہولینڈ نے اس دور سے ہی نوآبادیات کا ڈول ڈال دیا تھا۔ اس کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔ لیکن 1870 کے بعد ان ممالک کو اور نئی نوآبادیات کی ضرورت پڑی کیونکہ خود انگلستان کی صنعتوں نے اس قدر مال پیدا کرنا شروع کر دیا تھا کہ ان کو کھپانے کے لیے زیادہ زیادہ نئے ممالک کو غلام بنانا ضروری تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان صنعتی ممالک کو اب صنعتوں کے لیے زیادہ سے زیادہ خام مال کی ضرورت تھی۔ جو دُنیا کے دوسرے ملکوں سے ہی حاصل کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ امریکہ نے نوآبادیات حاصل کرنے کی طرف توجہ 1889 سے شروع کی۔ ایک امریکی سینیٹر البرٹ جے بیورج (Albert j, Beveridge) نے بوسٹن کے تاجروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''امریکہ کے کارخانے امریکی عوام کی ضرورت سے زیادہ سامان تیار کر رہے ہیں۔ امریکہ کی زمین اتنا غلہ پیدا کر رہی ہے جتنا امریکی باشندے استعمال نہیں کر سکتے۔ قسمت نے ہمارا طریق کار متعین کر دیا ہے دُنیا کی تجارت اب ہمارے ہاتھ میں آنی چاہیئے اور وہ آئے گی۔ ہم اسے اسی طرح حاصل کر لیں گے جس طرح مادر انگلستان نے ہم کو حاصل کرنے کا طریقہ سکھایا ہے۔ ہم پوری دُنیا میں اپنی تجارتی چوکیاں قائم کریں گے، امریکی مصنوعات انہیں چوکیوں سے تقسیم کی جائیں گی۔ ہم اپنے تجارتی بیڑوں سے سمندروں کو پاٹ دیں گے۔ ہم ایک بحری بیڑہ جو ہماری

قومی عظمت کے شایان شان ہوگا تیار کریں گے بڑی نو آبادیات جو اپنی حکومت کا نظام خود سنبھالیں گی ہمارا جھنڈا لہرائیں گی اور ہمارے ساتھ تجارت کر کے ہماری تجارتی چوکیوں کے آس پاس نشو ونما پائیں گی۔''

بہر حال یہ وہ دور تھا جب اجارہ درانہ صنعتوں نے اپنے مالکوں کے لیے خوب نفع کمایا، نفع پر نفع کے ڈھیر لگنے لگے اور اتنی دولت اکٹھی ہوگئی کہ دولت مند خود یہ سمجھنے سے قاصر نظر آنے لگے کہ اب اس دولت کو خرچ کہاں کریں۔ ادھر چھوٹے لوگوں نے بھی اپنی بچتوں کو بنکوں، بیمہ کمپنیوں اور تجارتی فرموں میں لگانا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرمایہ کی فراوانی حد سے بڑھ گئی۔ ویسے تو تمام دُنیا میں پسماندگی، جہالت دور کرنے، صحت بہتری کے لیے اور سڑکوں اور ذرائع نقل وحمل کی ترقی کے لئے بہ پناہ سرمایہ کی ضرورت تھی، لیکن اگر ان کاموں پر سرمایہ دار دُنیا سرمایہ صرف کرنے لگے تو وہ سرمایہ ہی نہیں رہتا۔ سرمایہ تو وہ ہے جو نفع پیدا کرے، چنانچہ انقلاب روس کے لیڈر لینن نے اپنی کتاب سامراج میں لکھا:

''کوئی شبہ نہیں اگر سرمایہ داری نظام کے کارپردازان زراعت کی ترقی پر جو ہر جگہ صنعت سے پیچھے ہے توجہ کرتے اور عوام کا معیار رہائش بلند کرنے کی کوشش کرتے تو آج سرمائے کے فاضل ہونے کا رونا نہ ہوتا۔ لیکن اگر سرمایہ یہ فرائض انجام دیتا تو وہ سرمایہ ہی نہ رہتا۔ سرمایہ جب تک سرمایہ ہے وہ کبھی عوام کے معیار رہائش کی بلندی اور بہتری پر صرف نہیں کیا جاسکتا۔ اس صورت میں سرمایہ داروں کے نفع میں کمی آئے گی وہ ایسا کبھی نہیں کریں گے۔ بلکہ اس سرمائے کو منافع کی افزائش کے لیے باہر دوسرے پسماندہ ملکوں میں لگائیں گے۔ پسماندہ ملکوں میں عام طور سے نفع کی شرح زیادہ ہوتی ہے۔ وہاں سرمائے کا فقدان ہوتا ہے، زمین کی قیمت نسبتاً کم ہوتی ہے، مزدوری بھی کم دینی پڑتی ہے اور مال بھی سستا ملتا ہے۔''

بعینہ یہی شکل پیش آئی۔ فاضل سرمائے نے ان پسماندہ ممالک، یعنی نو آبادیات، میں اپنے لیے گنجائش پیدا کر لی، پسماندہ ممالک ریلوں اور ذرائع نقل وحمل کے محتاج تھے۔ ان کو بجلی گیس اور سڑکوں کی بھی ضرورت تھی۔ اس کے برخلاف یہ مقامات قدرتی وسائل سے مالا مال تھے۔ چنانچہ یہاں کان کنی، باغبانی اور زراعت کے لئے خصوصی مراعات حاصل کی گئیں، بلکہ ان کو مراعات کہنا کچھ زیادتی ہوگی، یہ ایسی رعایتیں تھیں جو رعب، دھونس اور ریشہ دوانیوں، اور

نوآبادیات کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھا کر حاصل کی گئیں۔اور بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی، اس نفع کے علاوہ جو براہ راست اس کاروبار سے حاصل ہوتا تھا کچھ قرض بھی تقسیم کیا جاتا تھا، بالکل آجکل کے عالمی بنک کی طرح۔مثلاً انگلستان نے متحدہ ہندوستان اور ارجنٹینا میں ریلوں کا جال بچھایا اور اس کے لیے انگلستان نے قرضہ دیا۔لیکن ساتھ ہی اپنے ہاں ریل کے انجن بنانے اور پٹریاں تیار کرنے کے ٹھیکے بھی لے لئے۔یعنی اس قرض کا سود الگ حاصل کیا اور مال پر منافع الگ۔یہ نفع اور صنعت اور قرضہ دیئے جانے والے سرمایہ کے اتحاد کا ایک بالکل ہی نیا پہلو تھا۔

صنعت اور فاضل سرمائے کی نکاسی اور اس پر نفع کمانے کے سلسلے میں جو اتحاد عمل میں آیا اسی سے سامراج (imperialism) کیلئے فضا سازگار بنائی۔جے۔اے، ہوبسن پہلا مغربی مورخ تھا جس نے اس موضوع قلم اُٹھایا۔اس نے 1902 میں لکھا:

''بڑے بڑے مالکان صنعت اپنے فاضل سرمایہ کو نفع بخش کاروبار میں لگانے کیلئے بیرونی بازاروں کی جستجو کرتے ہیں تاکہ ان کی وہ مصنوعات جو اپنے ملک میں نہیں کھپ سکتیں بک جائیں اور وہ سرمایہ جو بیکار پڑا ہوا ہے کسی نفع بخش کاروبار میں لگ جائے۔ان تدبیروں کا نام جو ان مقاصد کے حصول کے لیے اختیار کی جاتی ہیں، امپیریلزم ہے۔''

امپیریلزم کے دور نے دُنیا میں ایک نیا نظام رائج کر دیا، اسی نئی صورت حال کو لینرڈ ولف (Leonard Woolf) نے ان الفاظ میں بیان کیا:

جس طرح پچھلی صدی میں یورپ کے قومی سماجوں میں دو کھلے ہوئے اور واضح طبقے..... سرمایہ دار اور مزدور، (لوٹنے والے اور لوٹے جانے والے) پیدا ہو گئے تھے اسی طرح اب بین الاقوامی برادری بھی دو طبقوں میں بٹ گئی۔ایک طرف مغرب کی سامراجی طاقتیں ہیں اور دوسری طرف مشرق اور افریقہ کی محکوم اقوام ہیں۔پہلا طبقہ حکومت کر رہا ہے اور لوٹ رہا ہے دوسرا طبقہ محکوم ہے اور لوٹا جا رہا ہے۔''

ویسے ایک حقیقت کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جو بھی طبقہ حکمران ہوتا ہے وہ ایسی حکومتی پالیسیاں وضع کرتا ہے جو اس کے اپنے اور اپنے حلیف طبقوں کے فائدوں کے لیے ہوتی ہیں۔جاگیرداری دور میں چونکہ سب سے اہم شئے انسان، زمین اور خزانے ہوتے تھے اس لئے اس

دور میں ملکوں پر سیدھے سیدھے فوجوں کو لے کر چڑھائی کر دی جاتی، قبضہ کر لیا جاتا، مال و دولت لوٹا جاتا، مندر اور معابد میں انسانوں کے چڑھائے ہوئے سونے، ہیرے اور جواہرات سب کو لوٹنا عین ثواب سمجھا جاتا۔ اب جب صنعتی اجارہ داروں کا دور آیا تو سرمایہ دار طبقوں کے لیے اہم چیزیں تجارت اور مارکیٹ بن گئے۔ سرمایہ داروں کیلئے دوسرے ملکوں میں یہ چیزیں حاصل کرنے کے لئے حکمرانوں نے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ حکومتیں سرمایہ کے اجارہ داروں کا محض ایک بازو تھیں۔ بیسویں صدی تک یہ بات ہر ایک کو نظر آنے لگی تھی ۔ انگلستان کے ایک تجزیہ نگار نے بیسویں صدی کے شروع میں رقم کیا:

''اس وقت 1921 کے خزاں میں انگریزی تجارت تمام تر بڑے بڑے مشترک سرمایوں کے قابو میں ہے۔ ان پر بڑے بڑے بنک اور ٹرسٹ حکومت کرتے ہیں پوری تجارتی مشین کا لیور (Lever) جو تجارت کی رفتار پر قابو رکھتا ہے ان کے ہاتھوں میں ہے۔ ان کا حکومتوں پر بھی جو ٹرسٹوں کے مشوروں کے بغیر چل نہیں سکتی ہیں پورا اقتدار حاصل ہے۔''

یہ بات صرف انگلستان پر ہی صادق نہیں آتی۔ اس بارے میں امریکہ کے صدر نافٹ (Taft) کا بیان آنکھیں کھولنے والا تھا۔

''ہماری خارجہ حکمت عملی کو انصاف کے سیدھے راستے میں سر مو تجاوز نہ کرنا چاہیئے، لیکن اپنے سرمایہ داروں کے نفع بخش کاروبار کے لیے مداخلت کر کے مواقع پیدا کرنا بھی ہماری خارجہ پالیسی میں شامل ہوگا۔''

اس ضمن میں امریکہ کے ایک میجر جنرل سمڈلے۔ ڈی بٹلر نے اپنی یادداشتوں میں بڑے فخر سے اقرار کیا:

میں نے تینتیس 33 برس چار ماہ اپنے ملک کے فوجی بحری بیڑے میں کام کیا ہے۔ میں سیکنڈ لیفٹننٹ سے لے کر میجر جنرل تک اپنے عہدے پر فرائض انجام دیئے ہیں ۔ میں نے اس تمام وقت میں بڑے بڑے تاجروں (وال سٹریٹ اور بینکروں) کے ایک بڑے زوردار کارکن کی حیثیت سے کام کیا۔ مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ میں وہ آدمی تھا جو سرمایہ داری کو نقطہ عروج پر پہنچانے کے لیے سرگرم عمل تھا۔ میں نے 1914 میں میکسیکو اور خاص طور سے ٹمپیکو کو امریکی تیل کے مفاد کے لئے محفوظ

بنایا۔ ہیٹی (Haiti) اور کیوبا کو نیشنل سٹی بنک کے لیے موزوں جگہ بنایا، تا کہ اس کے کارکن محاصل وصول کر سکیں۔ میں نے 1909 سے 1912 تک براؤن برادرز کے بین الاقوامی بنک کے لیے نکاراگوا کی ''صفائی'' کی۔ میں نے 1916 میں امریکی شکر کی کمپنیوں کی خاطر ڈومینکن ری پبلک میں ''روشنی'' کی۔ میں نے 1903 میں امریکہ کی پھل کی کمپنیوں کے لیے ہونڈیوراز کو ٹھیک ٹھاک'' کرنے میں مدد دی۔ میں نے 1927 میں چین میں سٹینڈرڈ آئل کمپنی کے تیل کے حفاظت کی تا کہ وہ کسی کی مداخلت کا شکار نہ ہو۔ اس تمام مدت میں میری حیثیت اس آدمی کی سی رہی جو غبارہ کی طرح پھول رہا ہو، مجھ کو خطابات ملے، تمغے عطا ہوئے اور ترقیوں سے میری عزت افزائی کی گئی۔ میرے خیال میں ال کپونے (ایک مشہور ڈاکو) کو بھی

ایک دو سبق سیکھا سکتا ہوں۔ اس نے تو اپنے کرتوت صرف شہر کے تین حصوں تک محدود رکھے تھے، ہم بحریہ کے فوجی تین براعظموں میں مصروف کار رہتے۔''

اس دُنیا میں جدھر بھی نظر اُٹھاؤ اجارہ داری کے جال پھیلے ہوئے نظر آئیں گے ایک وقت میں اہل علم سوچتے تھے کہ جب مشترک سرمائے کی بڑی بڑی بین الاقوامی کمپنیاں دُنیا کا بازار تقسیم کر لیتی ہیں تو خیال ہونے لگتا ہے کہ شاید اب مقابلے ختم ہو جائیں گے اور دُنیا امن کی نیند سو سکے گی۔ لیکن یہ خیال خواب ثابت ہوتا ہے یہی صورت نو آبادیات پر سیاسی تسلط کے ضمن میں صادق آتی ہے۔ ایک وقت تھا جب رقبہ وافر تھا اور اس پر کسی نے تسلط نہیں جمایا تھا۔ لیکن جب یہ زمین تقسیم ہو چکی تو محرومین، جن میں جرمنی، جاپان اور اٹلی شامل تھے، منڈیوں میں اپنا حصہ طلب کرنے لگے اور اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ جنگ۔ سرمایہ داری نظام کا بالآخر منطقی نتیجہ چھینا جھپٹی اور جنگ ہی ہوتا ہے خواہ یہ سرد جنگ ہو یا گرم جنگ ہو، چھوٹے ملکوں کے درمیان ہو یا بڑے ملکوں کے درمیان۔ لیکن سرمایہ داری نظام جنگ اور چھینا جھپٹی کے بغیر آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔

تیسری دُنیا کے رہنے والے ہوں یا صنعتی طور پر انتہائی ترقی یافتہ لوگ آج ہر شخص کسی نہ کسی انداز میں کساد بازاری، معاشی بحران (Sliump) اور ری سیشن جیسے الفاظ سے مانوس ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ کساد بازاری اور اقتصادی بحران آخر کس عمل کا نام ہے؟ ویسے تو دُنیا کی تاریخ مختلف قسم کے بحرانوں سے بھری پڑی ہے لیکن سرمایہ داری کے ارتقا کے بعد جو بحران پیدا ہوئے اور وہ

ان تمام بحرانوں سے مختلف ہیں جو پہلے زمانوں میں رونما ہوا کرتے تھے۔ انیسویں صدی سے پہلے فصلوں کی خرابی قحط سالی، جنگ یا اس قسم کے غیر معمولی واقعات بحرانوں کا موجب بنتے تھے۔ یہ تاریخ کا ایک غیر معمولی واقعہ ہوتا تھا۔ لیکن اب سرمایہ داری نظام کے وجود میں آنے کے بعد جو بحران رونما ہوتے ہیں وہ سرمایہ داری نظام کے وجود اور اس کے ارتقا کا ایک لازمی نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس بحران کی امتیازی وجہ ضروری اشیاء کی کمی نہیں ہوتی بلکہ اس کے بالکل برعکس یہ بحران ضروری اشیاء کی بے انتہائی فروانی کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس بحران میں اشیاء کی قیمتیں چڑھتی نہیں بلکہ گرتی ہیں۔ اس تجاتی بحران اور کساد بازاری کی دوسری نمایاں خصوصیت ایک عام بیروزگاری بھی ہے۔ سرمایہ اور محنت دونوں اپنی اپنی جگہ پر معطل اور بیکار نظر آتے ہیں۔ منافع کی شرح کم ہوجاتی ہے۔ صنعتی عمل میں بھی غیر معمولی سستی آجاتی ہے، پیداوار اور کاروبار میں سناٹا نظر آتا ہے۔ بے انتہا افراط زر کے باوجود غربت اور وہ بھی بے انتہا چاروں طرف پھیلی ہوئی نظر آتی ہے،

سرمایہ داری نظام میں بحرانوں کی جڑ یہ ہے کہ پوری پیداوار کا عمل نفع کی خاطر ہوتا ہے۔ چنانچہ امریکہ کا مشہور کالم نگار ولائر اپ مین (Walter Lipmann) نے امریکی کساد بازاری کے عروج کے زمانہ میں 13 جولائی 1934 کو اپنے اخبار ہیرلڈ ٹریبیون میں لکھا تھا:

''جب تک چھوٹے اور بڑے سرمایہ دار نفع کمانے کی نیت سے تجارتی مہموں میں اپنا سرمایہ لگانا بند نہ کریں موجودہ حالات سے نجات پانے کی اُمید نہ کرنی چاہئے۔ لیکن وہ ایسا کبھی نہ کریں گے۔ ان کی قوم پرستی کا خیال یا خدمت خلق کا جذبہ انہیں اس اقدام پر آمادہ نہیں کرسکتا۔ وہ یہ قدم صرف اسی وقت اُٹھا سکتے ہیں جب ان کو نفع کمانے کا موقع نظر آئے یہ سرمایہ داری نظام کا زمانہ ہے، اس زمانے کا یہی چلن ہے۔''

دوسرے الفاظ میں، معاشی بحران سرمایہ داری نظام کے سٹرکچر کا خاصہ ہیں۔ اس لئے وہ ماہرین معاشیات جو سرمایہ داری نظام کے اندر رہ کر بحرانوں کی وجہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں (اور ایسے ماہرین کی تعداد بہت ہے) وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ جیسے جیسے سرمایہ داری نظام بڑھتا جاتا ہے، اس میں ''ترقی'' ہوتی ہے، ویسے ویسے یہ بحران بھی شدید سے شدید تر ہوتے جاتے ہیں۔ آج پھر یہ بحران صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں انتہائی بے روزگاری، تشدد آمیز

نسل پرستی اور خاندانی اور انفرادی زندگیوں کی ٹوٹ پھوٹ کی صورت میں ہر جگہ بھیانک طور پر ظاہر ہو رہے ہیں۔ سرمایہ داری نظام قوموں کی دولت تو بڑھاتا ہے، لیکن ہم جو تیسری دُنیا میں رہتے ہیں، ان کو یہ سوالات کرنا ضروری ہیں۔ کہ یہ نظام کن کو دولتمند بناتا ہے، اور دوئم یہ کہ چند طبقوں اور چند ملکوں کو بے تحاشہ دولتمند بنانے کے لئے باقی انسانیت کو کیسی اندوہناک قربانیاں دینا پڑتی ہیں، اور یہ کہ کیا اس نظام کو کوئی متبادل نہیں، یعنی کوئی ایسا نظام نہیں جو صرف اندھا دھند نفع کمانے کا ہی انجن نہ ہو بلکہ جس کے سٹرکچر میں دولت کی منصفانہ تقسیم بھی ہوتا کہ کروڑوں محنت کش جو کھیتوں میں اور فیکٹریوں میں دولت بناتے ہیں انہیں ان کا حق مل سکے، اور وہ سب مل کر ایسے معاشرے کی تخلیق کر سکیں جہاں انسان کی تخریبی جبلتوں کی بجائے اس کی عقل کو اور تخلیقی قوتوں کو فروغ حاصل ہو؟

MashalBooks.com